عالمی شہر حیدرآباد

ڈاکٹر حمید الدین شرفی

بسلسلۂ تقاریب
جشنِ چار سو سالہ حیدرآباد

۱۹۹۱ء

سلسلہ مطبوعات روزنامہ سیاست ۲۳

مطبوعات سیاست (۲۳)

تاریخ حیدرآباد

بہ سلسلہ تقاریب جشن چارسو سالہ حیدرآباد

مصنف

ڈاکٹر حمید الدین شرفی

معاون

سعیدہ تنویر

جملہ حقوق بحق ادارہ سیاست محفوظ

تاریخ اشاعت	فروری ۱۹۹۴ء
تعداد	(۵۰۰)
طباعت	انتخاب پریس
قیمت	-/۱۵ روپے

ملنے کے پتے

بک سیل کاونٹر، روزنامہ سیاست، حیدرآباد

حسامی بکڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد

ترتیب

انتساب:

پیش لفظ: زاہد علی خاں صاحب، مدیر روزنامہ سیاست

عنوانات	صفحہ
دعا	۱
وجہ تاسیس	۱
سنہ تاسیس	۳
حیدرآباد قطب شاہی عہد میں	۵
بانی سلطنت سلطان قلی مغلوں کا عمل دخل	۱۰
آصف جاہی خاندان اور حیدرآباد	۱۳
سلطانی جمہور اور حیدرآباد	۲۰
ریاست آندھرا پردیش اور حیدرآباد	۲۱
دارالحکومت	۲۱
حیدرآباد کی بناوٹ	۲۳
چار مینار	۲۴
فصیل شہر اور دروازے	۲۵
کھڑکیاں، کمانیں، حوض	۲۶
حیدرآباد کی شاہراہیں اور پل	۲۷
حیدرآباد کے تالاب	۲۹
باولیاں باغات	۳۰
حیدرآباد کے محل	۳۲
حویلیاں اور دیوڑھیاں	۳۴، ۳۵
حیدرآباد کے محلے، کوچے، گلیاں	۳۷
حیدرآباد کے ریلوے اسٹیشن	۴۸
میوزیم، مجسمے، صنعتیں	۵۰
دواخانے	۵۱
حیدرآباد کے کلبس	۵۴
حیدرآباد کی جامعات	۵۴
مدارس	۶۱

عنوانات	صفحہ
کتب خانے	۶۴
اسٹیڈیم، فائر اسٹیشن	۶۵
آڈیٹوریم، بازی گاہیں	۶۶
حیدرآباد کی تہذیب	۶۷
حیدرآباد کی عمارتیں تاریخی ارتقاء	۷۰
دیوان خانے	۷۱
آداب نشست و برخواست	۷۲
رواداری	۷۴
حیدرآبادی سلام	۷۵
حیدرآبادیوں کا کھانا پینا	۷۹
حیدرآبادیوں کی سواریاں	۸۳
حیدرآباد اور فنون لطیفہ	۸۸
فن تعمیر	۸۹
موسیقی	۹۰
مصوری	۹۲
مجسمہ سازی، خطابت	۹۲
خوش نویسی، خطاطی	۹۳
کتابت، جلد سازی، ذوق و شوق	۹۴، ۹۵
نقالی، مشاعرہ	۹۵
رقص و سرود	۹۷
حیدرآباد کے مروج چند کھیل	۹۸
بچوں کے کھیل	۱۰۴

انتساب

حیدرآبادی تہذیب، شائستگی و شرافت کے آئینہ دار

اردو کے عظیم مبلغ

بلند قامت و باوقار صحافی

میر عابد علی خاں

موسس روزنامہ سیاست

کے نام

جنھیں حیدرآباد، حیدرآبادیت اور حیدرآباد والوں

سے بے حد محبت تھی۔

***

پیش لفظ

شہروں کے جشن تاسیس منانے کا رجحان نیا نہیں ہے ۔ یہ رواج بہ ہر پہلو سود مند ثابت ہو چکا ہے ۔ اس وسیلہ سے تاریخ، تہذیب و تمدن، ثقافت، طرز معاشرت اور فکر و نظر کے کئی گوشے اجاگر ہوتے ہیں جو نسلوں کے لئے عظیم ورثہ بن جاتے ہیں۔ یہی احساس جشن تاسیس حیدرآباد کا محرک تھا۔ گذشتہ 400 سال سے حیدرآباد کی پرکشش خاک نے ملک اور بیرون ملک سے مختلف عقائد، رنگ و نسل اور فکر و نظر کے حامل بہترین انسانوں کو یہاں بلایا اور اپنے اندر جذب کرلیا۔ کثرت میں وحدت کی ہندوستانی خصوصیت کا مکمل نمونہ حیدرآباد پیش کرتا ہے۔ حیدرآباد میں انسانی اقدار کی بڑی اہمیت ہے ۔ یہاں کا معاشرہ ان ہی اقدار پر مبنی ہے جو حیدرآبادی تہذیب کی عظمت کا نشان ہے ۔

پدر محترم جناب عابد علی خان مرحوم جشن تاسیس حیدرآباد کے محرک اور روح رواں تھے ۔ انھوں نے اپنے حین حیات اس سلسلہ میں کئی یادگار تقاریب کا انعقاد کیا تھا۔ ان کی ترغیب اور شخصی دلچسپی کے سبب یوروپ، امریکہ اور مشرق وسطی کے کئی شہروں میں تارکین وطن حیدرآبادیوں نے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ جشن تاسیس حیدرآباد کا اہتمام کرکے اپنی خاک سے نسبت کا ثبوت دیا۔ اس سلسلہ میں متعدد علمی مذاکرات، نمائشیں، مشاعرے اور پروگرام ہوئے چنانچہ تاریخ شہر حیدرآباد کی تدوین و ترتیب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے ۔

اس کتاب کی تیاری کا کام ڈاکٹر سید حمید الدین شرفی کو سونپا گیا۔ انھوں نے بڑی لگن، جستجو اور عرق ریزی سے اس محنت طلب پراجکٹ کو پورا کیا۔ انھوں نے نہایت عزم و استقلال اور حوصلہ مندی سے صرف دو ڈھائی سال کے مختصر سے عرصہ میں کئی سو صفحات پر مشتمل مواد اکٹھا کردیا جس کا ایک ہی جلد کی صورت میں شائع کیا جانا عملاً دشوار تھا لہٰذا طے کیا گیا کہ اس کا ملخص شائع کیا جائے ۔ محترمہ سعیدہ تنویر نے شبانہ روز محنت اور مستقل مزاجی سے تلخیص کی ۔ بعد ازاں جناب مہندر راج سکسینہ کو نظر ثانی کی زحمت دی گئی ۔ پدر محترم جناب عابد علی خاں صاحب کی خواہش تھی کہ یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع ہو جائے مگر ایسا نہ ہوسکا۔ ان کے سانحہ ارتحال کے ایک سال بعد ادارہ سیاست اس کی اشاعت کے ذریعہ ان کی خواہش کی تکمیل کررہا ہے ۔ یہ بجاطور پر کہا جاسکتا ہے کہ حیدرآباد کے 400 سالہ تقاریب کے سلسلے میں انگریزی، تلگو، مرہٹی میں حیدرآباد پر متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں مگر اردو میں کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ شہر حیدرآباد پر یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے ۔ مجھے قوی توقع ہے کہ یہ کتاب حیدرآباد ہی میں نہیں بلکہ تمام علم دوست حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

زاہد علی خاں

مدیر روزنامہ سیاست، حیدرآباد

دعا

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع

بانی شہر حیدرآباد سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یہ دعا بارگاہ خداوندی میں ایسی مستجاب ہوئی کہ پورے چار سو سال سے یہ شہر آباد اور روبہ ترقی ہے۔ گردش لیل و نہار، انقلابات دہر اور سیاسی اتھل پتھل نے اس شہر کو اجاڑنے کے بجائے مزید سنوارا، اس کے حسن کو بڑھایا۔ ہر تبدیلی کے بعد اس کی اہمیت اور وسعت میں بتدریج اضافہ ہوا بانی شہر نے جس تمنا کا اظہار کیا تھا آج شہر کی وسعت، آبادی اور رونق کو دیکھ کر دعا کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

وجہ تاسیس

شہر حیدرآباد کی وجہ تاسیس کے ضمن میں مختلف خیالات ملتے ہیں۔ مولف ماہ نامہ کہتے ہیں۔

"محمد قلی نے یہ شہر اپنی ماں بھاگ رتی کی خواہش پر آباد کیا۔
بھاگ رتی محمد قلی قطب شاہ کی ماں تھی محبوبہ نہیں تھی۔۔

محمد عبدالرحمن نے حیدرآباد کی تاسیس کا سبب سلطان محمد قلی قطب شاہ کے مزاج شاہانہ کو قرار دیا ہے ایک بار بادشاہ قلعہ گولکنڈہ سے جانب مشرق شکار کے لئے نکلا اس علاقہ کی سرسبزی و شادابی اتنی بھائی کہ ایک شہر بسانے کا حکم دیا۔

محمد حسین خاں کا خیال ہے کہ قلعہ گولکنڈہ شاہی جاہ و حشمت اور سلاطین قطب شاہیہ کے شایان شان نہ تھا شاہی مہمانوں کے ٹھہرانے اور بیرونی سفیروں کے لئے خاطر خواہ انتظام گولکنڈہ میں دشوار تھا اس وجہ سے ایک عالیشان شہر کی بنیاد رکھی گئی۔

شہر حیدرآباد صرف بادشاہ، شاہی خاندان اور چند امراء کی رہائش کے لئے تعمیر کیا گیا۔ یہاں عام لوگوں کو بسنے کی اجازت نہ تھی۔ اس خیال کی تردید خود بانی شہر کی دعا سے ہوتی

فرشتہ نے لکھا ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے یہ شہر اپنی معشوقہ بھاگ متی کے نام بسایا!

حیدرآباد کی وجہ تاسیس کے اسباب میں قلعہ گولکنڈہ کی بڑھتی ہوئی آبادی، شاہی اور سفارتی

ضروریات اور خود بادشاہ کی اس علاقہ سے دلچسپی شامل ہیں۔ فرشتہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا بھاگ متی سے عشق اس شہر کی بناء کے ضمن میں اہمیت رکھتا ہے۔

نام

فرشتہ کا خیال ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس کا نام اپنی معشوقہ بھاگ متی کے نام پر بھاگ نگر تجویز کیا۔ (تاریخ فرشتہ)

خافی خاں نے بھی فرشتہ کے بیان سے اتفاق کیا ہے۔ (منتخب اللباب)

محمد حسین خاں کا بھی یہی خیال ہے۔ (احکم التاریخ)

محمد نجم الغنی خاں لکھتے ہیں۔

"....اس جدید شہر کا نام بھاگ نگر رکھا جس کے معنی بختاور شہر ہوتے ہیں۔ (تاریخ ریاست حیدرآباد)

ڈاکٹر زور بیان کرتے ہیں۔

"... جب بھاگ متی کو حیدر محل کا خطاب دیا تو بھاگ نگر کا نام تبدیل ہوگیا۔ بھاگ نگر کے بجائے یہ شہر حیدرآباد سے موسوم ہوا۔"

محمد جعفر حسین انصاری رقمطراز ہیں۔

ابتدائی سلاطین قطب شاہیہ شیعہ مسلمان تھے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کو اپنے مذہبی عقائد سے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے اس شہر کو حضرت علی کے مشہور لقب حیدر کرار کی مناسبت سے حیدرآباد سے موسوم کیا۔ (مرقع عثمانی)

ملا محمد قاسم فرشتہ نے تبدیلی نام کے ضمن میں اس خیال کا اظہار کیا ہے۔

شہر کے قدیم نام بھاگ نگر کے سبب چند لوگ بادشاہ پر طنز کرنے لگے جس پر اسے غیرت آئی اور شہر کا نام بدل ڈالا۔ بھاگ نگر کے بجائے نیا نام حیدرآباد رکھا۔ (تاریخ فرشتہ)

مغل تاجدار شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے جب گولکنڈہ کا محاصرہ کیا تو اس نے ... نام بدل کر دارالجہاد رکھا اور جب عالمگیر کو فتح نصیب ہوئی اور ابوالحسن تاناشاہ گرفتار ہوگیا تو اس

مسرت میں دوبارہ اس کا نام تبدیل کیا گیا۔ دارالجہاد کے بجائے فرخندہ بنیاد کہا جانے لگا۔ عالمگیر نے قلعہ گولکنڈہ کا نام بدل کر قلعہ محمد نگر رکھا۔(تاریخ ریاست حیدرآباد)۔

بھاگ نگر نام ان مورخین کے نزدیک زیادہ اہم ہے جو سلطان محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے معاشقہ کو حقیقت سمجھتے ہیں۔ بھاگ نگر سے حیدرآباد کے نام کی تبدیلی کا سبب بھی بھاگ متی کے خطاب حیدر محل کو بتاتے ہیں جب کہ مورخین کا دوسرا گروہ بھاگ متی یا بھاگ نگر کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا۔ بانی شہر کی حضرت علی مرتضی حیدر کرار سے عقیدت کے سبب ان کے اسم گرامی سے انتساب کو مانتا ہے۔ حیدرآباد کی وجہ تسمیہ کے ضمن میں موخرالذکر نظریہ ہی قرین قیاس ہے۔عالمگیر کا دیا ہوا نام "دارالجہاد" چند روز مروج رہا۔ بعد میں لوگ یہ نام بھول گئے۔

سنہ تاسیس

بناء حیدرآباد کے اسباب اور وجہ تسمیہ کی طرح سنہ تاسیس کے سلسلہ میں بھی مختلف آراء ہیں۔

محمد حسین خاں، محمد جعفر خاں، محمد نجم الغنی خاں اور سید ہمایوں مرزا نے حیدرآباد کا سنہ تاسیس 1000 ھ بتایا ہے جس کی مطابقت 1591 ء کے ساتھ ہوتی ہے۔ (احکم التاریخ، مرقع عثمانی، تاریخ ریاست حیدرآباد اور آثار صناد ید دکن)۔ کرشنا سوامی مدیراج نے حیدرآباد کی بنیاد کا سال 1590 ء (پکٹوریل حیدرآباد)، رضا علی خاں نے 92-1591 (اے سٹی ان ہسٹری) اور راے ست گرو پرشاد نے 1592 ء بتایا ہے۔(فرخندہ بنیاد)۔

حیدرآباد کی بنیاد چارمینار کی تعمیر کے ساتھ رکھی گئی۔ چارمینار کی تعمیر کا آغاز 999 ھ میں ہوا اور تکمیل 1000 میں ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی شہر کی تعمیرات کا آغاز ہوا۔ گویا چارمینار کی تکمیل اور حیدرآباد کی تعمیرات کے آغاز کا ایک ہی سال یعنی 1000 ھ ہے۔

شہر حیدرآباد کی تعمیرات کا آغاز 1000 ھ سے ہوا اور اختتام 1006 ھ کو ہوا۔ (تاریخ ریاست حیدرآباد)

چارمینار کا مادہ تاریخ یا حافظ سے نکلتا ہے جس کے اعداد 1000 ہیں۔ مادہ تاریخ اختتام تعمیرات و تکمیل شہر حیدرآباد "فرخندہ بنیاد" سے برآمد ہوتا ہے۔ (دکن میں اردو)

دہلی کے اجڑنے اور بسنے کی ایک طویل داستان ملتی ہے۔ کچھ لوگ سات بار اور چند دہلی کے پندرہ مرتبہ برباد ہونے اور پھر سے آباد ہونے کی بات کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یہ شہر جب سے بسا ہے آج تک آباد ہے زندگی کی ساری رعنائیوں اور رونقوں کے ساتھ پھلتا پھولتا چلا آرہا ہے۔ چار صدیوں میں دو چار مرتبہ ہی کچھ وقت کے لئے امن و سلامتی کا ماحول درہم برہم ہوا حالاں کہ کئی بار اقتدار کی کشاکشی سیاسی نشیب و فراز، نظم و نسق میں تغیر و تبدل ہوا۔

قلی قطب شاہ اور بھاگ متی

بالاحصار گولکنڈہ

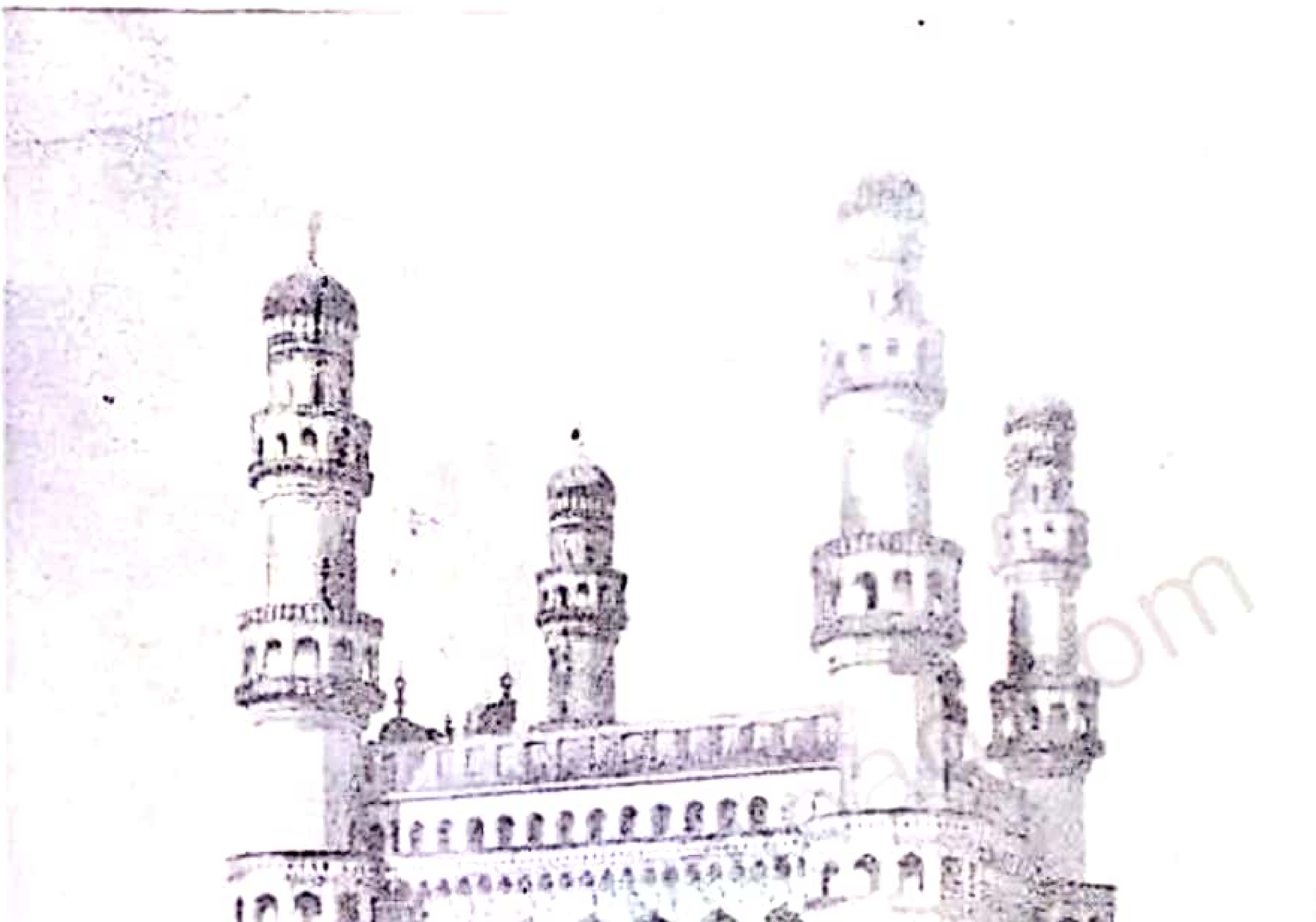

چارمینار

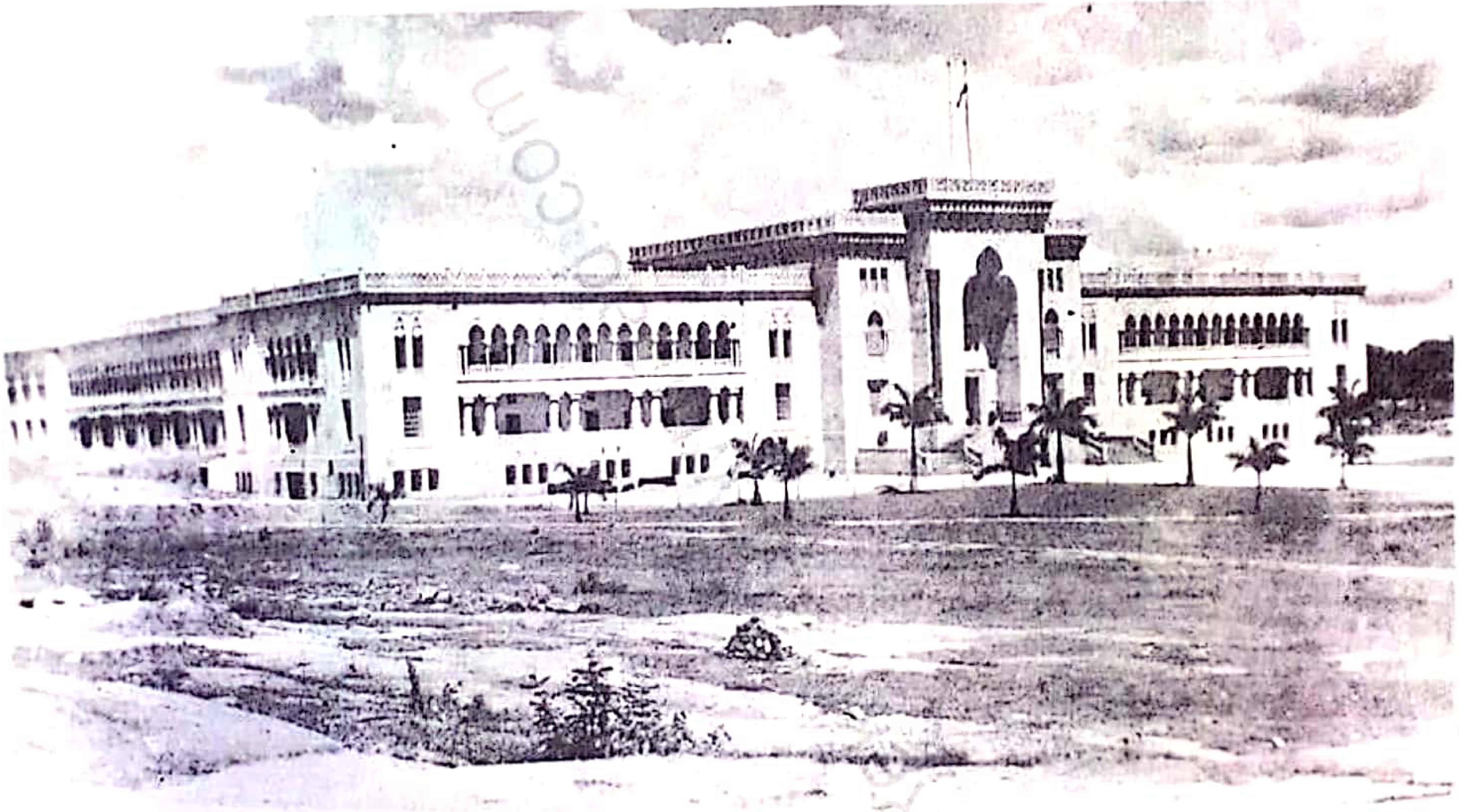

عثمانیہ یونیورسٹی

حیدرآباد کی داستان محبت، رواداری، تہذیبی رنگا رنگی، آپسی احترام اور زندگی کی حرارت سے عبارت ہے۔ ملا محمد قاسم نے حیدرآباد سے متعلق اپنے احساسات کا یوں اظہار کیا ہے۔

" تمام ہندوستان میں شرقاً غرباً شمالاً جنوباً کوئی ایسا شہر نہیں جو حیدرآباد کی مثل ہو۔۔"

(تاریخ فرشتہ)

خانی خاں نے حیدرآباد کی ایسی تصویر کھینچی ہے۔

"اس شہر کی خوش وضعی عمارات، حوض، آب و ہوا، حسن ملیح جاذبیت اور کشش ایسی ہے کہ ان کے بیان سے سخن عاجز ہے۔۔(منتخب اللباب)

محمد ساقی نے اپنے تاثرات کو اس طرح قلمبند کیا ہے۔

" یہ شہر زمین پر جنت کا ایک قطعہ ہے یہاں جسم و جان کے لئے راحت ہے۔ یہاں کی آبادی خیال کی وسعت سے زیادہ ہے۔۔(مآثر عالمگیری)

مولانا خواجہ الطاف حسین حالی فرماتے ہیں۔

صحن گلشن میں کوئی کام کو آنے کوئی
جانے گا بونے ریاحیں سے معطر ہوکر
حیدرآباد بھی اک باغ ہے ماشاء اللہ ہے جہاں فیض کا دروازہ کشادہ سب پر

(زنظم حالی)

علامہ اقبال کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

نور کے ذروں سے قدرت نے بنائی یہ زمین
آئینہ نیکے دکن کی خاکِ اگر پائے نشار

(کلام اقبال)

حضرت جوش ملیح آبادی کا حیدرآباد کو سلام۔

حیدرآباد اے نگار گل بداماں السلام السلام اے قصر ماضی کے عنوان السلام
میرے قصر زندگی پر اے دیار محترم تو نے ہی کھولا تھا ذوق علم کا زریں علم

(نظم۔جوش)

اب جہاں حیدرآباد واقع ہے وہاں ماضی میں چھوٹے چھوٹے قریے تھے جن میں سے ایک

موضع چچلم بھی تھا جو حیدرآباد دکن میں واقع ہے۔ دکن جنوبی ہند کا وہ علاقہ ہے جو بندھیاچل کے جنوب میں اور کرشنا و تنگبھدرا کے شمال میں سطح سمندر سے تقریباً 1250 فٹ بلند ہے۔ (جغرافیہ دکن) دکن کی آبادی دنیا کی قدیم آبادیوں میں سے ایک ہے۔ یہاں کے قدیم باشندے آسٹرونگریڈ، نگریڈ، ویدک اور دراوڑی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ماضی میں یہ علاقہ بے حد ترقی پذیر تھا۔ موریا سلطنت کے حدود دکن سے گذر کر مدورائی تک پہنچ چکے تھے بعد میں آندھرا خاندان کو غلبہ حاصل ہوا۔ (جنوبی ہند کی تاریخ) اور دکن پر 400 برس تک حکومت کرتا رہا۔ ان کے بعد چالوکیہ خاندان کو عروج نصیب ہوا۔ پھر راشٹرکوٹ نے غلبہ حاصل کیا۔ بعد ازاں علی الترتیب چکری راج، یادوراج، ہوئی سیل راج اور کاکتیہ کو اقتدار ملا۔

کاکتیہ خاندان کے راجہ پرتاپ رودرا نے 1309ء میں سلطان علاء الدین خلجی کی اطاعت قبول کرلی اور دکن میں پہلی بار مسلمانوں کا عمل دخل ہوا۔ (فرخندہ بنیاد)

دہلی کے سلاطین نے دکن سے بے پناہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ محمد تغلق نے دیوگیر (دولت آباد) کو پایہ تخت قرار دیا۔ بعد میں دکن کے امیران صدہ نے دہلی سے ناطہ توڑ کر 1345ء میں ظفر خان کی سرکردگی میں خود مختاری کا اعلان کردیا۔ ظفر خان نے علاء الدین حسن بہمنی شاہ کے لقب کے ساتھ سلطنت بہمنیہ کی بناء ڈالی۔ 1525ء تک بہمنی سلطنت رہی بعد میں یہ پانچ علحدہ صوبوں میں تقسیم ہوگئی۔ ناظم تلنگانہ سلطان قلی نے بھی خود مختاری کا اعلان کرکے علحدہ سلطنت قائم کرلی جس کا مستقر گولکنڈہ کو قرار دیا

(دکن کے بہمنی سلاطین)

حیدرآباد کے بسنے سے پون صدی پہلے ہی اس علاقہ پر سے بہمنی سلطنت کے اقتدار کا سورج غروب ہوچکا تھا۔ (تاریخ فرشتہ)

حیدرآباد۔ قطب شاہی عہد میں۔ بانی سلطنت سلطان قلی

دکن میں خاندان قطب شاہیہ کا بانی سلطان قلی ہمدانی الاصل تھا۔ ہمدان کے موضع سعدآباد میں پیدا ہوا۔ سنہ ولادت 860ھ مشہور ہے۔ اس کے والد کا نام اویس قلی تھا۔ قلی بمعنی غلام کے ہیں۔ کم عمری میں نامساعد حالات کے باعث اپنے چچا اللہ قلی بیگ کے ساتھ بہ غرض سوداگری بیدرآیا۔ اللہ قلی بیگ نے سلطان محمود بہمنی کے دربار میں رسائی حاصل کی سلطان قلی کو بھی باریابی کا موقع ملا۔ چند دنوں بعد اللہ قلی بیگ واپس لوٹ گیا لیکن سلطان قلی کو ایوان شاہی میں قیام کا شرف حاصل ہوا۔ اس نے یہاں سخت محنت اور دلچسپی سے مختلف علوم وفنون میں کمال حاصل کیا۔ یہاں تک کہ سلطان محمود بہمنی نے اسے ناظم تلنگانہ مقرر کردیا۔ سلطان قلی کو قطب الملک کا خطاب بھی

ملا۔ سلطان محمود بہمنی کے انتقال کے بعد وہ1518 ء میں مرکز سے انحراف کر کے خود مختار بن گیا۔ گولکنڈہ کو پایہ تخت بنایا اور اطراف واکناف کے 70 قلعوں پر تسلط حاصل کرلیا۔ اس کے حدود سلطنت دور دور تک قائم ہوگئے۔ پانگل، مچھلی پٹن، راجمنڈری، راج کنڈہ کونڈاپلی اور ویلور تک اس کا سکہ چلنے لگا۔(احکم التاریخ)

سلطان قلی نے 34 سال حکومت کی وہ نہایت قابل اور حوصلہ مند بادشاہ تھا۔950 ھ میں بہ عمر90 سال اپنے ہی فرزند جمشید قلی کی ایماء پر قتل کیا گیا۔ قلعہ گولکنڈہ کے قریب دفن کیا گیا۔

جمشید قلی

جمشید قلی نے اپنے کبر سن والد سلطان قلی کو ایک شخص میر محمود ہمدانی کے ذریعہ قتل کروایا۔ اپنے بھائی اور ولیعہد سلطنت کو اندھا کر کے خود تخت گولکنڈہ پر قابض ہوگیا۔ اس نے 7 سال حکومت کی اس کا دور بدامنی، انتشار اور بدانتظامی کے سبب پرسکون نہ تھا۔ جمشید قلی اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ ابراہیم قلی کو بھی ختم کردینا چاہتا تھا مگر وہ کسی طرح بچ نکلا۔ جمشید قلی نے عارضہ سرطان میں مبتلا ہوکر 957 ھ میں انتقال کیا۔(تاریخ دکن)

سبحان قلی

جمشید قلی کے انتقال کے بعد اس کے کم سن فرزند سبحان قلی کو تخت نشین کیا گیا۔ سیف خاں عین الملک مدار المہام بنے عین الملک کے مظالم کے سبب سبحان قلی کی حکومت بہت جلد ختم ہوگئی۔ (تاریخ گولکنڈہ)

سلطان ابراہیم قطب شاہ

شہزادہ ابراہیم قلی بیجانگر میں راجہ رام راج کے پاس مہمان تھا۔ امراء گولکنڈہ نے عین الملک کے ظلم و تشدد سے بددل ہوکر شہزادہ ابراہیم کو گولکنڈہ کا تخت وتاج سنبھالنے کی دعوت دی۔ سبحان قلی گرفتار ہوا۔ عین الملک فرار ہوگیا اور سلطان ابراہیم قطب شاہ نے 957 ھ میں سلطنت گولکنڈہ کی باگ ڈور سنبھالی۔

سلطان ابراہیم بڑے عزم و ہمت والا تھا۔اس نے گولکنڈہ کو استحکام بخشا۔ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان محبت و بھائی چارگی کو فروغ دیا۔ خود عالم اور شاعر تھا۔ کئی زبانوں سے واقف تھا۔ علوم وفنون سے دلچسپی رکھتا تھا۔اس کے عہد میں تالاب ابراہیم پٹن، حسین ساگر، کتوہ بدویل وکنکوٹ، فصیل گولکنڈہ، کالا چبوترہ، پرانا پل، جھلہ مولاعلی، کئی مسجدیں، سرائے، خانقاہیں اور عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ خیریت آباد کا محل اور باغ بنوایا۔ سلطان ابراہیم نے 31 سال حکومت کی۔

988 ھ میں بعمر 51 سال انتقال کیا۔ گولکنڈہ میں دفن کیا گیا۔ (تاریخ دکن)

سلطان محمد قلی قطب شاہ

سلطان ابراہیم قطب شاہ کا فرزند اور سلطنت گولکنڈہ کا نامور حکمران تھا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد 988 ھ م 1580 ء میں تخت گولکنڈہ پر بیٹھا۔ (تاریخ دکن)

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا عہد سلاطین عالم کا دور قمر کہلاتا ہے۔ اس کے معاصر پادشاہوں کی اقبال مندی اور ان کے طرز حکومت کی غیر معمولی خصوصیات، سلطنتوں کے حسن انتظام اور استحکام، سلطنتوں کے حدود کی وسعت، ترقی، خوشحالی، امن و سلامتی، علوم و فنون کی ترویج و اشاعت اور تہذیب و ثقافت کے فروغ کی بناء پر یہ دور قرطاس تاریخ پر انمٹ نقش چھوڑ گیا ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے معاصر حکمرانوں میں ہندوستان میں مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر (اکبر اعظم) کی حکومت تھی، اکبر اعظم کا دور مغلیہ سلطنت کے استحکام، ترقی اور تہذیب و تمدن کے گنگا جمنی امتزاج کا یادگار زمانہ تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کا ابتدائی 6 سالہ دور حکومت بھی سلطان محمد قلی نے دیکھا تھا۔

مصر میں اس دور میں سلطان عبد العزیز المتوکل علی اللہ تخت خلافت پر رونق افروز تھا۔ والیان مصر و شام خلیفہ کی رسمی اطاعت بھی باعث سعادت سمجھتے تھے۔ قسطنطنیہ میں سلاطین عثمانیہ کے تین حکمران اس عہد میں فرمانروا رہے جن میں سلطان مراد خاں، سلطان محمد خاں ثالث اور سلطان احمد خاں اول شامل ہیں۔ اس دور میں ان کی حکومت کا اقبال بہت بلند تھا۔

قدیم و عظیم سلطنت ایران پر شاہ عباس صفوی کا سکہ چلتا تھا۔ ایران اس دور میں عروج و کمال کی منزلیں سر کر رہا تھا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ایران ہی سے توثیق حکومت اور سند شاہی منگوائی تھی۔

انگلستان میں پہلے ملکہ الزبتھ پھر کنگ جیمس دوم تخت نشین رہے۔

دکن میں گولکنڈہ کی معاصر سلطنتیں یہ تھیں۔ عادل شاہی (بیجاپور)، نظام شاہی (احمد نگر) عماد شاہی (برار) اور برید شاہی (بیدر) لیکن احمد نگر اور برار پر مغل سلطنت کا غلبہ ہو چکا تھا اور بیدر کا عادل شاہی سلطنت میں انضمام ہو گیا تھا۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ اگرچہ کہ اپنے بھائیوں میں تیسرا تھا۔ اس سے دو بڑے بھائی موجود تھے اور اس کے بعد اور تین بھائی بھی تھے مگر گولکنڈہ کا تخت اس کے مقدر میں تھا۔ اس نے 988 ھ م 1580 ء سے 1020 ھ م 1612 ء تک 32 سال نہایت شان و شوکت سے حکومت کی تخت نشینی کے وقت اس کی عمر 14 سال اور چند ماہ تھی لیکن حسن عمدگی کے ساتھ اس نے سلطنت

گولکنڈہ کو استحکام بخشا اور ملک کو ترقی دی وہ اس کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی ساری زندگی عیش و آرام میں گذری۔ اس کے باوجود اس نے نہایت بالغ نظری سے سیاسی و ملکی مسائل حل کئے۔ تہذیب وثقافت، علوم وفنون اور مذہبی اقدار کے تحفظ کے ضمن میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کئی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کی پہلودار شخصیت کا ہی اثر تھا کہ گولکنڈہ استحکام، خوش حالی اور ترقی کا ایک مثالی نمونہ پیش کرتا ہے۔ سلطان محمد قلی نہایت جفاکش، شجیع، عادل، حوصلہ مند، علوم وفنون کا شیدائی اور بلند پایہ شاعر تھا۔ ازروئے تحقیق تاحال وہی اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر مانا جاتا ہے۔ (کلیات محمد قلی قطب شاہ)

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنے 32 سالہ دور حکومت میں مختلف حالات کا سامنا کرتے ہوئے بھی علاقہ جات تلنگانہ، آندھرا اور کرناٹک کے چند حصوں کو لسانی بنیادوں پر جوڑ کر ایک سیاسی مرکز کے تحت منظم و منضبط کر دیا تھا گویا چارسو سال پیشتر ہی اس بادشاہ نے لسانی ریاست آندھراپردیش کا جو خاکہ تیار کیا تھا وہ دوبارہ 1956 ء میں آزاد ہندوستان کے نقشہ پر ابھرا کیوں کہ - سلطنت گولکنڈہ کے حدود، سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں دریائے تنگبھدرا کے نیچے پنگنڈہ اور کندی کوٹہ، دریائے گوداوری کے اوپر سکاکول، راج مندری اور گنٹور تک تھے۔ راج مندری اور گنٹور قطب شاہی عساکر کی اہم چھاونیاں تھیں۔ موسلمورگ، نندیال، کھلکور، کندی کوٹ کے علاوہ کرناٹک میں وجیانگر کے اکثر علاقے اس کے زیر اثر تھے۔ (تاریخ گولکنڈہ)

قدیم آندھرائی سلطنت کے حدود کا احیا، سلطان محمد قلی قطب شاہ نے سلطنت گولکنڈہ کے پرچم کے سائے میں کر کے تلگو بولنے والوں کی عظمت رفتہ کا تحفظ کیا۔ آج جب ہم سلطان محمد قلی کو اس پس منظر میں دیکھتے ہیں تو وہ صرف بانی شہر حیدرآباد ہی نہیں بلکہ ریاست حیدرآباد کا معمار بھی نظر آتا ہے۔

سلطان محمد قلی کے عہد میں گولکنڈہ نے بے حد ترقی کی۔ اس نے سنہ 1000 ھ میں شہر حیدرآباد بسایا۔ یہاں عالیشان محلات، مساجد، عاشورخانے، عمارتیں، بازار، باغات، سرائے اور دواخانے بنائے۔ 49 سال زندہ رہا۔ 32 سال نہایت شان سے حکومت کی۔ 1020 ھ م 1611 ء میں انتقال کیا۔ (تاریخ عزیز دکن)

سلطان محمد قطب شاہ

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بھتیجا سلطان محمد تخت نشین ہوا۔ سلطان محمد، سلطان محمد قلی کا داماد بھی تھا۔ یہ بڑا نیک دل، متقی، رحمدل، منصف مزاج اور صلح جو بادشاہ

تھا۔ اس کی ماں سیدانی تھیں اسی وجہ سے اس کے نام کے ساتھ لفظ قلی کالاحقہ نہیں ہے۔ ننہیال کے سادات ہونے کے سبب سلطان محمد اور اس کے جانشینوں کے نام کے ساتھ قلی کا خاتمہ ختم ہوگیا۔

سلطان محمد قطب شاہ کو اپنے چچا سلطان محمد قلی کی طرح تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ اس نے حیدرآباد سے ذرا دور ایک نیا شہر بسانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ چنانچہ اس غرض کے لئے 9 لاکھ ہن منظور کئے۔ ایک عالیشان قلعہ کی بنیاد ڈالی۔ سلطان نگر نامی شہر میں کئی عمدہ عمارتیں تیار کروائیں۔ اس قلعہ کی باقیات اب بھی موجود ہیں۔

سلطان محمد قطب شاہ نے ہی مکہ مسجد کی تعمیر شروع کی۔ بلاشبہ یہ مسجد اس بادشاہ کی عظیم الشان یادگار کے طور پر ساری دنیا میں مشہور ہے۔ اس مسجد کی تعمیر پر تیس ہزار ہن خرچ کئے گئے۔ مسجد کے سنگ بنیاد رکھنے کے سلسلے میں ایک واقعہ بحد مشہور ہے۔ تقریب سنگ بنیاد کے موقع پر یہ اعلان کیا گیا کہ وہ شخص اس کا سنگ بنیاد رکھے جس کی نماز تہجد قضا نہ ہوئی ہو۔ جب کوئی بھی آگے نہ آیا تو سلطان نے یہ کہہ کر کہ گذشتہ بارہ سال سے میری تہجد کی نماز قضا نہیں ہوئی ہے، اپنے مبارک ہاتھوں سے مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد میں شہر میں کئی عالیشان عمارتوں کی تعمیر ہوئی۔ اس کا دور حکومت امن و خوشحالی، ترقی اور سلطنت کے عروج کا تھا۔ نجومیوں کے مشورہ پر سلطان نے 12 سال تک اپنے فرزند عبداللہ مرزا کو نہیں دیکھا۔ 34 سال کی عمر میں اس نیک اطوار حکمران نے عارضہ تپ محرقہ کے باعث انتقال کیا۔ جملہ 21 سال حکومت کی۔ 1611ء سے 1631ء تک اس کا زمانہ حکومت گولکنڈہ کا سنہری عہد کہلاتا ہے۔ (احکم التاریخ)

سلطان عبداللہ قطب شاہ

سلطان محمد قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سلطان عبداللہ قطب شاہ نے تخت شاہی پر جلوس کیا۔ اس کے معاصرین میں شہنشاہ شاہجہاں دہلی میں حکمران تھا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ اپنے والد کی طرح نہایت نیک خصلت اور صلح جو طبیعت کا مالک تھا۔ اس میں بے پناہ انتظامی صلاحیتیں تھیں۔ اندرون ملک بہترین نظم و نسق قائم کیا۔ ہمیشہ جنگ و جدال سے گریز کرتا تھا۔ میر جملہ سلطنت گولکنڈہ کی فتنہ انگیزیوں کے سبب شاہجہاں کے فرزند عالمگیر سے صلح کی ایک کروڑ نقد تاوان دینا پڑا۔

سلطان عبداللہ کو اولاد نرینہ نہیں ہوئی۔ 3 لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکی کا عقد اپنے بھتیجے ابوالحسن سے کیا جو بعد میں اس کا جانشین اور تاناشاہ کے نام سے مشہور ہوا۔ سلطان عبداللہ نے 42 سال

حکومت کی۔ سلاطین گولکنڈہ میں سب سے زیادہ مدت تک سریرآرائے تخت شاہی رہا۔ 1672ء میں انتقال کیا۔ (حدیقۃ السلاطین)

سلطان ابوالحسن تاناشاہ

سلطان ابوالحسن تاناشاہ، سلطان عبداللہ کا بھتیجا اور داماد تھا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے انتقال کے بعد میر مظفر کی سعی سے بادشاہ بنا۔ ابتداء میر مظفر کو وزیر بنایا گیا۔ بعد میں مادنا کو وزارت دی گئی۔ اس کا بھائی اکنا پیشکار بنا۔ یہ دونوں برہمن بھائی چند دنوں میں سلطنت کے مختار کل بن گئے۔ (احکم التاریخ)

سلطان ابوالحسن تاناشاہ قلندر صفت، سخی اور درویشوں کی صحبت میں رہا کرتا تھا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی خزانہ کا ایک حصہ غرباء میں تقسیم کر دیا۔ ابوالحسن بڑا نازک مزاج بادشاہ تھا۔ اس کی اس خصوصیت کی بناء پر "تاناشاہ" کے نام سے مشہور ہوا۔

سلطان ابوالحسن تاناشاہ نے 70 سال عمر پائی۔ اس کی زندگی کے 5 دور گذرے۔ اس نے بچپن کے 14 سال شاہی سرپرستی میں گذارے، 14 سال تحصیل علم میں اور 14 سال ایک خاص صوفیانہ ماحول میں بسر کئے۔ 14 سال بادشاہی کی اور 14 سال قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں۔

مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے گولکنڈہ پر تسلط حاصل کرنے کے لئے بہت جد و جہد کی۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں زر کثیر وصول کر کے بھی اسے اطمینان نہ ہوا۔ شہنشاہ عالمگیر نے سلطنت دہلی کی عظیم ترین ذمہ داریوں اور پیرانہ سالی کے باوصف دکن کی اس سلطنت کے خاتمہ کے لئے بے پناہ تکلیف اٹھائی۔ شہنشاہ عالمگیر کے حملوں کا سلطان ابوالحسن تاناشاہ نے نہایت پامردی اور حوصلہ مندی سے سات ماہ تک مقابلہ کیا۔ اس دوران زبردست معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ بالآخر ایک غدار عبداللہ خاں نے گولکنڈہ والوں سے بے وفائی کی اور مغل سپاہیوں کے لئے قلعہ گولکنڈہ کا دروازہ کھول دیا۔ تاناشاہ کو شکست ہوئی۔ اورنگ زیب کے حکم پر گرفتار کیا گیا اور 14 برس دولت آباد میں قید رہا۔ 1672ء سے 1686ء تک حکومت کی۔ 1700ء میں انتقال کیا۔

مغلوں کا عمل دخل اور حیدرآباد

ابوالحسن تاناشاہ کی شکست اور گرفتاری کے بعد حیدرآباد پر مغل تاجدار اورنگ زیب عالمگیر کا مکمل تسلط ہو گیا۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے صوبہ دکن پر اپنے وفادار ملازم بہادر دل خاں المعروف جاں سپار خاں کو مامور کیا۔ اس نے 1695ء تک حیدرآباد کا انتظام نہایت عمدگی کے ساتھ چلایا۔ وہ پہلے بیدر کا قلعہ دار بنایا گیا تھا۔ فتح گولکنڈہ کے بعد اسے حیدرآباد کی نظامت تفویض کی گئی۔

جاں سپار خاں کے انتقال کے بعد شہنشاہ اورنگ زیب نے اس کے فرزند رستم دل خاں کو ناظم حیدرآباد مقرر کیا۔ بعد میں دو سال کے لئے رستم دل خاں کو کرناٹک بھیج دیا گیا۔ اس کے غیاب میں حیدرآباد پر داؤد خاں کو مقرر کیا گیا۔ واپسی پر دوبارہ رستم دل خاں کو صوبہ حیدرآباد پر حاکم مقرر کیا گیا اور داؤد خاں کو ہٹا دیا گیا۔ رستم دل خاں کو اپنے دور صوبہ داری میں مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ صوبہ میں بغاوت، لوٹ مار اور بدامنی کے حالات پیدا ہونے لگے۔ پاپڑا نامی ایک شخص نے بغاوت کا پرچم بلند کیا اور شاہ پور کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ رستم دل خاں نے اس کے استیصال کی بے حد کوشش کی لیکن پاپڑا کو گرفتار نہ کر سکا۔ (تاریخ دکن)۔

1118 ھ م 1707ء میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے وفات پائی۔ مغل شاہزادوں میں تخت شاہی کے لئے رسہ کشی کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ اورنگ زیب کے جانشین کی حیثیت سے بہادر شاہ نے تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ شاہزادہ کام بخش بیجاپور میں تھا۔ عالمگیر کی رحلت کی خبر پا کر اس نے دو ماہ کے اندر بیجاپور میں امراء کو منصب و خطابات سے سرفراز کیا اور یہیں پر شاہانہ جلوس کر کے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کیا۔ بہادر شاہ نے لاکھ چاہا کہ کام بخش ان حرکات سے باز آجائے مگر وہ نہ مانا۔

کام بخش نہ صرف بیجاپور بلکہ حیدرآباد پر بھی اپنا تسلط چاہتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے گلبرگہ پر غلبہ حاصل کیا اور حیدرآباد کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں اچانک یورش کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے صوبہ دار حیدرآباد رستم دل خاں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور پوری طرح حیدرآباد کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ رستم دل خاں زیادہ دیر تک کام بخش کا اعتماد قائم نہ رکھ سکا۔ کام بخش نے کسی بات سے ناراض ہو کر رستم دل خاں کو قید کیا۔ بعد میں بے دردی کے ساتھ قتل کروا دیا۔ اس طرح حیدرآباد کام بخش کے زیر تصرف ہو گیا۔ (احکم التاریخ)

شاہ عالم بہادر شاہ برابر کام بخش کو انتباہ دیتا رہا کہ وہ اپنی حرکات سے باز آجائے۔ بہادر شاہ نے یہاں تک لکھا کہ اگر وہ شہنشاہ دہلی کا سکہ اور خطبہ جاری کرے اور سالانہ خراج ادا کرتا رہے تو اس سے تعرض نہیں کیا جائے گا اور صوبہ دکن اس کے قبضہ میں رکھا جائے گا مگر کام بخش نے ایک نہ مانی۔ قاصد شاہی کو قید کر دیا۔ اس کا ظلم و ستم رعایا پر روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ بہادر شاہ نے اس کی تادیب کا ارادہ کیا اور شاہی فوج کے ساتھ دکن کی طرف پیشقدمی کی۔ ادھر کام بخش نے بھی لڑائی کی ٹھانی۔ دونوں بھائیوں میں بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ جنگ کا نتیجہ کام بخش کے خلاف نکلا اسے بری طرح شکست ہوئی۔ دوران جنگ زخمی ہو کر گر پڑا۔ شاہ عالم بہادر شاہ کے سامنے اس نے دم توڑ دیا۔

بہادر شاہ نے یوسف خاں روز بھانی کو حیدرآباد کا صوبہ دار مقرر کیا۔ یوسف خاں نے بہترین نظم و نسق قائم کیا۔ باغیوں کو سخت سزائیں دیں۔ پاپڑا کو گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچایا۔ یوسف خاں نے 1713 ء تک یعنی فرخ سیر کے عہد تک صوبہ دار حیدرآباد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

*rB

یوسف خاں کی وفات کے بعد فرخ سیر نے مبارز خاں کو صوبہ حیدرآباد پر مقرر کیا۔ مبارز خاں کے عہد میں مغلیہ سلطنت کی کمزوری سے حالات بدلنے لگے۔ 1718 ء میں مبارز خاں نے سلطنت دہلی سے انحراف کیا۔ نواب نظام الملک آصفجاہ دکن آنے اور مبارز خاں سے مقابلہ کیا اور مبارز خاں کو شکست دے کر قتل کر دیا۔

1719 ء میں آصف جاہ نے دکن کا صوبہ اپنے اقتدار میں لیا۔ (تاریخ دکن)

آصف جاہی خاندان اور حیدرآباد

جب سلطنت دہلی کمزور ہوگئی اور بادشاہ کی حکومت برائے نام رہ گئی تو راجپوتانہ اودھ، بنگال وغیرہ خود مختار بن بیٹھے۔ دکن میں نواب نظام الملک آصف جاہ فتح جنگ انگریزوں کے کاروبار ملکی میں مداخلت سے قبل ہی خود مختار ہوگئے۔(تاریخ دکن اختر وفصاحت)

نظام الملک آصفجاہ کا نسبی سلسلہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے واسطہ سے حضرت امیرالمومنین ابوبکر صدیق تک پہنچتا ہے۔ ان کے جد اعلیٰ بخارا کے قاضی تھے۔ نظام الملک کے دادا خواجہ عابد بعہد شاہجہاں ہندوستان آئے۔ پھر حجاز مقدس روانہ ہوئے بعد فراغت حج و زیارت جب دوبارہ وارد ہند ہوئے تو اورنگ زیب کی ملازمت اختیار کی۔

1658ء میں اورنگ زیب کے اعلان بادشاہی کے بعد خواجہ عابد صدر کل کے عہدہ پر مامور کئے گئے بعد میں اجمیر اور ملتان کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ 1676ء میں اورنگ زیب کی ایماء پر امیر قافلہ حج بن کر حجاز گئے۔ واپسی پر قلیچ خان کے خطاب اور بیدر کی صوبیداری سے سرفراز ہوئے۔ 1687ء میں گولکنڈہ کے محاصرہ کے دوران زخمی ہوکر وفات پائی اور موضع عطاپور حیدرآباد میں مدفون ہوئے۔(بستان آصفیہ)

فیروز جنگ

خواجہ عابد نے شہنشاہ اورنگ زیب کی خواہش پر اپنے فرزند اکبر شہاب الدین کو سمرقند سے ہندوستان طلب کیا۔ اورنگ زیب نے انہیں منصب سے سرفراز کیا اور مغلیہ سلطنت کے وزیر سید سعد اللہ خاں کی صاحبزادی سے شادی کروادی۔ 1681ء میں خطاب "خان" عطا کیا۔ شہاب الدین کے بہادرانہ کارناموں اور بادشاہ کے ساتھ وفاداریوں کے صلہ میں مزید انعامات و خطابات سے نوازے گئے۔ "قلعہ راہیر" کی تسخیر کے کارنامہ پر انہیں فیروز جنگ کے خطاب سے سرفراز کیا گیا ساتھ ہی ماہی مراتب کا اعزاز بھی بخشا گیا۔

شہزادہ محمد اعظم کے ساتھ بیجاپور کے محاصرہ کے دوران جانثارانہ خدمات انجام دیں۔ بعد

میں بیجاپور کی فتح کی مسرت میں بادشاہ نے انہیں "فرزند ارجمند" کے خطاب سے نوازا۔ گولکنڈہ کے محاصرے میں شاہی افواج کے سپہ سالار مقرر ہوئے۔ ہفت ہزاری منصب عطا ہوئی۔ 1689ء میں طاعون کے زیر اثر بینائی سے محروم ہوئے اس کے باوجود جنگی معرکوں میں بادشاہ کی طرف سے شریک ہوتے رہے۔ مالوہ کی بغاوت کو اسی حالت میں کچل دیا۔ اورنگ زیب نے انہیں برار کی صوبہ داری عطا کی۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مالوہ کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ یہیں پر 8/ ڈسمبر 1710ء کو انتقال کیا۔ دہلی میں دفنائے گئے۔ (مملکت آصفیہ)

آصف جاہ اول

نام قمرالدین۔ والدہ چوں کہ سیدانی تھیں اس وجہ سے میر کہلائے۔ 11/ اگسٹ 1671ء کو پیدا ہوئے۔ تاریخی نام نیک بخت ہے جس سے 1082ھ برآمد ہوتی ہے۔ کم عمری میں منصب سے نوازے گئے۔ شاہی محلات میں پرورش پائی۔ 26 سال کی عمر میں مرہٹوں کے خلاف مہمات میں بہادری سے حصہ لیا۔ 1700ء میں بیجاپور۔ پھر 1702ء میں بیجاپور اور کرناٹک کے صوبہ دار ہوئے۔ 1705ء میں واکنکھیڑے کو مسخر کیا۔ چین قلیچ خان کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ 1706ء میں دوبارہ بیجاپور کے صوبہ دار بنے۔

بہادر شاہ نے انہیں خاں دوراں بہادر خاں کے خطاب سے نوازا۔ صوبہ دار اودھ اور فوجدار لکھنو بنائے گئے۔ بعد میں ملازمت شاہی سے الگ ہوگئے اور گوشہ نشینی اختیار کرلی۔

فرخ سیر نے 1713ء میں انہیں نظام الملک فتح جنگ کے خطاب کے ساتھ دکن کی صوبہ داری حوالے کی۔ بعد میں دکن سے ہٹا کر سنبھل اور مرادآباد کی فوجداری پر بھیجے گئے۔ 1717ء سے 1718ء تک مرادآباد میں رہے۔ سیاسی ریشہ دوانیوں کے سبب معزول و معتوب ہوئے پھر 1719ء میں بہار کے صوبہ دار بنائے گئے لیکن دہلی سے باہر نہیں نکلے۔ اسی سال فرخ سیر کا قتل ہوا اور رفیع الدرجات تخت نشین ہوئے۔ نظام الملک کی اہمیت کے پیش نظر انہیں مالوہ کی صوبہ داری پر مامور کیا گیا جسے انہوں نے چار و ناچار قبول کیا۔

رفیع الدرجات کے بعد اسی سال رفیع الدولہ پھر محمد شاہ تخت دہلی پر متمکن ہوئے۔ بادشاہ گر سادات بارہہ نے نظام الملک کے خلاف مالوہ کی طرف فوج بھیجی۔ نظام الملک نے دکن کا رخ کیا۔ اسیر گڑھ، برہان پور کی تسخیر کرتے ہوئے حسن پور میں دلاور علی خاں کو شکست دی۔ بالاپور کے مقام پر عالم علی خاں کو زیر کیا۔ موخرالذکر دونوں امراء سادات بارہہ کے مقرب خاص تھے۔ ان کے قتل کی اطلاع نے دہلی میں ہلچل مچادی۔ سادات نے خود محمد شاہ کو ساتھ لے کر دکن کا ارادہ کیا لیکن بہت جلد سادات کا خاتمہ ہوگیا اور سلطنت دہلی کو فتنوں سے نجات ملی۔

محمد شاہ نے خلاف وعدہ نظام الملک کے ایک عزیز محمد امین خاں کو وزارت پر مامور کیا جس سے انہیں بحد صدمہ ہوا لیکن محض برادرانہ پاسداری کی بناء پر محمد امین خاں کے خلاف اقدام نہ کیا۔ 3 ماہ بعد جب محمد امین فوت ہونے تو 1722 ء میں وزیر سلطنت مغلیہ بنے لیکن بادشاہ کے مصاحبین کی سازشوں سے نالاں رہے اور رخصت لے کر دکن کی طرف چل پڑے۔

بادشاہ نے مبارز خاں کو صوبہ دار دکن مقرر کر دیا۔ نظام الملک اورنگ آباد پہنچے 1724 ء میں مبارز خاں سے مقام شکر کھیڑہ معرکہ آرائی ہوئی۔ مبارز خاں مارا گیا۔ یہ فیصلہ کن جنگ دکن میں سلطنت آصفیہ کے قیام کی بنیاد بنی۔ شکر کھیڑہ کی فتح کے بعد وہ اورنگ آباد آنے اور فوجی افسروں کو خطابات و انعامات سے نوازا۔ بعد ازاں حیدرآباد وارد ہونے اور گوشہ محل کو اپنے قیام کے لئے منتخب کیا۔

شکر کھیڑہ کے واقعہ کے بعد محمد شاہ کو نظام الملک کی قوت و حیثیت کا اندازہ ہو گیا چناں چہ اپنے وقار کے تحفظ کے لئے آصف جاہ اول کی اجازت طلبی کے بغیر انہیں دکن میں رہنے کی اجازت دے دی۔ محمد شاہ نے نظام الملک کو آصف جاہ کے خطاب سے ممتاز کیا۔ نظام الملک نے ان حالات میں بھی شاہی تخت سے وابستگی ختم نہیں کی۔ برابر دارالسلطنت دہلی کے مطیع اور جفاکش رہے۔ (احکم التاریخ) محمد شاہ کی رنگ رلیوں کے سبب مرکزی حکومت روز بہ روز کمزور ہونے لگی جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تو نظام الملک کو دہلی طلب کیا گیا تاکہ حالات سدھارے جا سکیں۔ سلطنت دہلی کی بقاء وسلامتی کے لئے وہ دکن سے روانہ ہونے۔ یہاں اپنے منجھلے فرزند ناصر جنگ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔

آصف جاہ کے دہلی پہنچنے پر ان کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا۔ نوبت نقارے بجانے گئے بادشاہ اور خلقت نے بے پناہ مسرت کا اظہار کیا۔ نظام الملک نے یہاں وکیل مطلق کا عہدہ سنبھالا اور ممکنہ حالات کو درست کیا۔ فوج کو منظم کیا۔ مرہٹوں کی سرکوبی کی۔ 1739 ء میں پانی پت کے مقام پر نادرشاہ سے مقابلہ ہوا۔ محمد شاہ کی شکست کے بعد نادرشاہ کے ساتھ صلح میں بنیادی رول ادا کیا۔ بد قسمتی سے دہلی میں حالات نے یکایک پلٹا کھایا۔ نادرشاہ نے قتل عام کا حکم دے دیا۔ دہلی میں آگ اور خون کی ہلاکت خیز ہولی کھیلی جانے لگی۔ محمد شاہ کی ایماء پر نظام الملک برہنہ سر شمشیر حمائل کئے۔ نادرشاہ کے روبرو گئے جو سنہری مسجد کے صحن میں تلوار بے نیام کئے بیٹھا تھا۔ نادر نے پوچھا کیا چاہتے ہو۔ نظام الملک نے حافظ کا یہ شعر پڑھا۔

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی　　　مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

نادر کے دل پر اس شعر نے ایسا اثر کیا کہ اس نے "بہ ریش سفید ت بخشیدم۔ کہہ کر تلوار نیام میں رکھ لی جس کے بعد قتل عام موقوف ہوا۔

اس قدر عظیم سانحہ کے باوجود محمد شاہ کی عادتوں میں فرق نہ آیا۔ نظام الملک دل برداشتہ ہوگئے۔ اسی دوران 1741ء میں ناصر جنگ نے دکن پر اپنی صوبیداری کا اعلان کر دیا۔ آصفجاہ دکن روانہ ہوئے۔ ناصر جنگ کو بہت سمجھایا مگر بے سود ہوا۔ آخر کار باپ بیٹے میں زبردست جنگ ہوئی۔ ناصر جنگ نے شکست کھائی۔ باپ کے آگے نادم ہوئے۔ بعد میں دونوں باپ بیٹے حیدرآباد آئے چھ سات سال مختلف معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔ 1747ء میں احمد خاں ابدالی کے دہلی پر حملہ کی اطلاع سن کر برہان پور تک آئے تھے کہ شاہی افواج کی فتح کی خبر سن کر۔یہیں رک گئے۔ 1748ء میں بمقام برہان پور انتقال کیا۔ انہوں نے 7 بادشاہوں کا دور دیکھا۔ 87 لڑائیاں لڑیں۔ 79 سال کی عمر پائی۔ 29 سال حکومت کی اور اپنے ورثاء کے لئے دکن کی ایک مستحکم حکومت چھوڑی۔ (مملکت آصفیہ)

ناصر جنگ

نظام الملک آصفجاہ اول کے چھ لڑکے اور چھ لڑکیاں تھیں۔ فرزند اکبر غازی الدین خاں فیروز جنگ دربار دہلی میں دکن کے نمائندہ تھے۔ ناصر جنگ جن کا نام میر احمد علی خاں تھا منجھلے بیٹے تھے۔ نظام الملک کے انتقال کے بعد غازی الدین علی خاں کو صوبہ دار دکن تسلیم کیا گیا اور ناصر جنگ کو دہلی طلب کیا گیا۔ وہ ایک لاکھ پیادہ اور ستر ہزار سوار کے ساتھ دہلی روانہ ہوئے۔ نربدا کے پاس بادشاہ کی طرف سے دوبارہ حکم پہنچا کہ " دکن کا نظم و نسق سنبھالو۔ دہلی آنا ملتوی رکھو۔ ادھر ان کے بھانجے مظفر جنگ نے بغاوت کر دی۔ صرف دو سال کے مختلف ہنگامہ پرور واقعات کے بعد ایک غدار، ہمت خاں نے بمقام پانڈیچری انہیں شہید کر دیا۔

مظفر جنگ: پورا نام ہدایت محی الدین خاں، نظام الملک کے نواسے تھے۔ ناصر جنگ کی شہادت کے بعد فرانسیسیوں کی تائید سے صوبہ دار ہونے کا اعلان کیا لیکن ہمت خاں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

صلابت جنگ: مظفر جنگ کے قتل کے بعد فرانسیسیوں نے صلابت جنگ کو مسند نشین کیا۔ ان کا پورا نام سید محمد خاں تھا۔ یہ نظام الملک آصف جاہ اول کے فرزند سوم تھے۔ 1752ء میں اقتدار سنبھالا۔ بادشاہ دہلی احمد شاہ نے انہیں صوبہ داری دکن کا پروانہ بھیجا۔ ان سے مقابلہ کے لئے غازی الدین خاں لشکر جرار کے ساتھ دہلی سے نکلے مگر بمقام اورنگ آباد فوت ہوئے۔ ان کی لاش دہلی واپس لائی گئی۔ صلابت جنگ کا 9 سالہ عہد بڑے ہنگامہ خیز واقعات سے پر ہے جن میں مرہٹوں کے ساتھ لڑائیاں شامل ہیں۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی نظام علی خاں کو آصفجاہ ثانی کا خطاب دے کر ولی عہد مقرر کیا۔ صلابت جنگ 1174ھ م 1761ء میں قلعہ بیدر میں قید کر دیئے گئے۔

بحالت اسیری 1762ء راہی ملک عدم ہوئے۔ بیدر میں ملتانی پاشاہ کی درگاہ کے قریب مدفون ہیں

آصف جاہ ثانی

میر نظام علی خاں نام، نظام الملک کے چوتھے فرزند تھے۔ 1734ء میں پیدا ہوئے بعمر 28 سال سلطنت کی ذمہ داری سنبھالی۔ 42 سال حکومت کی۔ 71 سال کی عمر میں وفات پائی۔ سلطنت آصفیہ کا استحکام، انگریزوں سے اعانت طلبی، حیدر علی سے معاونت اور ٹیپو سلطان سے معرکہ آرائی اہم واقعات ہیں۔ 6/ اگسٹ 1803ء میں انتقال کیا۔ صحن مکہ مسجد میں دفن ہوئے۔ ان کے 8 فرزند تھے۔ (مملکت آصفیہ)

آصف جاہ ثالث

میر نظام علی خاں نظام الملک آصف جاہ ثانی کے فرزند دوم میر اکبر علی خاں سکندر جاہ 7/ ربیع الاخر 1218ھ م 1803ء کو جانشین مسند ہوئے۔ انگریزوں کی تائید اور اصرار پر میر عالم کو دیوان مقرر کیا۔ سکندر جاہ نے اندرونی سازشوں اور پنڈاروں کی شورش کو ختم کرنے کی بے حد کوشش کی۔ چندولال کی پیش کاری کا زمانہ سلطنت کے لئے بے حد گراں ثابت ہوا۔ انہی کے زمانے میں انگریزوں اور سکندر جاہ کے بھائی مبارزالدولہ کے درمیان خطرناک جھڑپیں ہوئیں۔ نواب سکندر جاہ کو آخر عمر میں دق ہوگیا تھا۔ انہوں نے 17/ ذیقعدہ 1244ھ م 1829ء میں انتقال کیا۔ 62 سال کی عمر پائی تھی۔ ساڑھے چھبیس سال حکومت کی۔ (تاریخ دکن)۔

آصف جاہ رابع

پورا نام میر فرخندہ علی خاں، خطاب ناصرالدولہ۔ 1208ھ م 1792 میں پیدا ہوئے۔ مقام پیدائش بیدر بتایا جاتا ہے۔ 1829ء میں تخت آصفی پر قدم رکھا۔ ناصرالدولہ نے غیر ملکی مصنوعات کے استعمال نہ کرنے کا حکم جاری کیا تھا۔ خود بھی مصنوعات ملکی اور دیسی اشیاء کے استعمال کے پابند رہے اور اپنی رعایا کو بھی ترغیب دی۔ ان کے زمانے میں سلطنت سخت معاشی بحران کا شکار رہی۔ انگریزوں سے برار کا معاہدہ کرنا پڑا۔ 1857ء میں بعمر 66 سال انتقال کیا۔ 29 سال حکومت کی صحن مکہ مسجد میں دفنائے گئے۔ (احکم التاریخ)۔

آصف جاہ خامس

ناصرالدولہ کے فرزند اکبر میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ آصف جاہ خامس کی حیثیت سے

1273 ھ م 1857 ء میں وارث سلطنت آصفیہ ہوئے۔ ان کی تخت نشینی کے 4 دن بعد ہی ہندوستان میں تحریک آزادی کا پہلا غلغلہ بلند ہوا۔ یہاں رزیڈنسی پر آزادی کے متوالوں نے ہلہ بول دیا۔ حکومت آصفیہ کی متوازن حکمت عملی کے سبب حالات قابو سے باہر نہ ہونے پائے۔ انگریزوں کو سالار جنگ کے انتظام اور افضل الدولہ کے رویہ سے اطمینان تھا۔

افضل الدولہ پر انگریزوں نے دباؤ ڈالا کہ سکہ تبدیل کر دیا جائے لیکن انہوں نے ٹال دیا۔ جب اصرار بہت بڑھا تو مجبوراً آصفجاہی سکہ جاری کیا گیا۔ 1858ء سے حیدرآباد میں افضل الدولہ کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ یہ ایک خود مختار حکومت کی علامتیں تھیں۔ ملکہ وکٹوریہ نے "جی سی ایس آئی۔" کا خطاب پیش کیا۔ (مملکت آصفیہ)۔

افضل الدولہ نے 13/ ذیقعدہ 1285 ھ م 1869ء کو انتقال کیا۔ انہوں نے 12 سال تک نہایت کامرانی کے ساتھ حکومت کی اور مختلف حالات کا بڑی سنجیدگی سے سامنا کیا۔ ان کے عہد میں سلطنت آصفیہ کو مسلمہ حیثیت حاصل ہوئی۔ افضل الدولہ نہایت وجیہ شکیل اور قوی ہیکل تھے۔ انتقال کے وقت ان کے جانشین نواب میر محبوب علی خاں کی عمر صرف 2 سال تھی۔

آصف جاہ سادس

نواب افضل الدولہ کے فرزند نواب میر محبوب علی خاں نے بعمر 2 سال 1869ء میں سلطنت آصفیہ کی گراں بار ذمہ داری بحیثیت مطلق العنان بادشاہ سنبھالی۔ بادشاہ کی کمسنی کے سبب سالار جنگ اور شمس الامراء پر مشتمل ریجنسی قائم ہوئی جو آصف جاہ سادس کی طرف سے امور سلطنت انجام دینے پر مامور تھی۔ دس سال کی عمر میں دربار قیصری میں شاہانہ انداز سے شرکت کی۔ دارالعلوم علی گڈھ میں سپاسنامہ قبول کیا۔ آصفجاہ سادس کی تعلیم و تربیت خاص ڈھنگ سے ہوئی۔

6/ ربیع الثانی 1301 ھ م 1884 کو لارڈ رپن نے تخت نشینی کی رسم ادا کر کے حکومت کے کامل اختیارات نواب محبوب علی خاں کے حوالے کئے۔ 1893ء میں "مجلس وضع قوانین" قائم ہوئی 1899ء میں کلکتہ کا سفر کیا۔ 1903ء میں جلسہ تاجپوشی قیصر ہند شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم میں شرکت کے لئے دہلی گئے۔ آصف جاہ سادس بڑے جری، بڑے حوصلہ مند، سخی، مہمان نواز، غریب پرور، رحمدل اور ولی صفت بادشاہ تھے۔ وہ رعایا کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ خود عالم تھے اور اہل علم و فضل کی قدر کرتے تھے۔ شاعر تھے اور آصف تخلص تھا۔

2/ رمضان 1329 ھ م 2/ اگسٹ 1911ء کو طبیعت ناساز ہوئی۔ 2 دن بعد وفات پائی۔ مدت حکومت 42 سال ہے۔ عمر 44 سال۔ صحن مکہ مسجد میں دفن ہوئے۔ (تاریخ دکن)

آصف جاہ سابع

میر عثمان علی خاں نظام الملک آصف جاہ سابع نے 14/ رمضان 1329ھ م 1911ء کو تخت شاہی پر جلوس کیا۔ ان کی تعلیم و تربیت بہت خاص ڈھنگ سے ہوئی تھی۔ بہترین دماغ پایا تھا۔ کئی زبانوں کے ماہر اور فنون سپاہ گری سے پوری طرح واقف تھے۔ اچھے شاعر تھے اور عثمان تخلص تھا۔ امور سلطنت میں بے مثال تھے۔ اپنے والد کے ساتھ "جشن تاجپوشی قیصر ہند" میں شریک ہوئے تھے۔ بعد میں خود بھی بحیثیت تاجدار 1911ء کے جشن تاج پوشی میں شرکت کی۔ 1914ء کی جنگ عظیم کے موقع پر سلطنت برطانیہ کی فراخ دلی سے اعانت کی۔ انہیں 1918ء میں ہز اگزالٹیڈ ہائی نس (یار وفادار سلطنت برطانیہ) کا لقب پیش کیا گیا۔

1917ء م 1336ھ میں جامعہ عثمانیہ کے قیام کی تحریک منظور کی۔ 1918ء میں ایک منشور کے ذریعہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کا اعلان کیا۔ یہ سارے ملک میں واحد یونیورسٹی تھی جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ 1919ء میں باب حکومت کا قیام عمل میں لایا انہیں 1924ء میں سلطان العلوم کا لقب پیش کیا گیا۔ اسی سال جشن خود اختیاری کے موقع پر معرکتہ الاراء تقریر کی جو سلطنت آصفیہ کے قیام اور سلطنت مغلیہ کے ساتھ اس کے قدیم اور مضبوط تعلقات پر نہایت بسیط خطبہ تھا۔ 1927ء میں عثمانیہ میڈیکل کالج کا آغاز کیا۔ 1928ء میں ریلوے لائنوں کا افتتاح کیا۔ 1930ء میں حکومت حیدرآباد نے ریلویز کو قومیالیا۔ 1931ء میں شہزادوں کی شادی ترکی شہزادیوں سے کی۔ 1932ء میں موٹر بس سروس شروع کی۔ 1933ء میں علاقہ ریذیڈنسی واپس ملا۔ 1934ء میں جامعہ عثمانیہ کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ 1936ء میں دہلی کا سفر کیا۔ اسی سال علاقہ برار پر مالکانہ حقوق حاصل کئے۔ اسی سال جشن سلور جوبلی منایا گیا۔ 1939ء میں دوسری عالمگیر جنگ کے چھڑ جانے پر حکومت برطانیہ کی فوج اور نقد رقم سے امداد کی۔ 14/ ، 15/ اگست 1947ء کو برصغیر ہند و پاک کو آزادی ملی۔ ہندوستان کے ساتھ ایک سال کے لئے معاہدہ ہوا۔

13/ ستمبر 1948ء کو پولیس ایکشن ہوا۔ انڈین آرمی کے حملے کے نتیجے میں افواج آصفی نے ممکنہ مقابلہ کی کوشش کی مگر ہتھیار ڈال دینا پڑا۔ حیدرآباد کا انڈین یونین میں انضمام عمل میں آیا اور حضور نظام آصف سابع تخت و تاج سے محروم کردیئے گئے۔ 26/ جنوری 1950ء کو حیدرآباد مکمل طور پر حکومت ہند کے تحت ہوگیا۔ حضور نظام راج پرمکھ بنائے گئے۔ یکم اپریل 1951ء کو افواج آصفی کو تحلیل کردیا گیا۔ 1953ء سے 1956ء تک ریاست حیدرآباد کے دستوری سربراہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 31/ اکتوبر 1956ء کو راج پرمکھ کا عہدہ ختم کردیا گیا۔

آصف جاہ سابع نے 14/ ذیقعدہ 1386ھ م 24/ فروری 1967ء کو وفات پائی۔ 37

سال حکومت کی 16 سال معزولی کی زندگی گذاری۔ مکہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور مسجد جودی روبرو کنگ کوٹھی اپنی والدہ کے پائین مدفون ہوئے۔

سلطانی جمہور اور حیدرآباد

15/ اگست 1947ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔ آزادی سے پہلے ہی ریاست حیدرآباد کے موقف کے ضمن میں اعلیٰ سطح پر بات چیت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ حیدرآباد میں سیاسی سرگرمیاں نقطہ عروج پر تھیں۔ انڈین یونین میں انضمام یا حکومت ہند سے اشتراک کے متعلق گفتگو کے کئی دور ہوئے۔ گفت وشنید کے موضوعات حسب ذیل تھے۔1۔ برار کی واپسی۔2۔ حیدرآباد کا نوآبادیاتی درجہ 3۔ انضمام حیدرآباد۔ آصف جاہ سابع انضمام ریاست کے حق میں نہ تھے۔ وہ حیدرآباد کی سالمیت اور انفرادیت کی برقراری کے خواہاں تھے لیکن حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ حضور نظام کو 29/ نومبر 1947ء کو حکومت ہند کے ساتھ ایک سمجھوتہ پر دستخط کرنے پڑے جسے معاہدہ جاریہ Standstill Agreement سے موسوم کیا جاتا ہے۔ معاہدہ جاریہ کی شرائط کے تحت مسٹر کے ایم منشی حیدرآباد میں حکومت ہند کے ایجنٹ جنرل مقرر ہوئے۔ اسی دوران چند ایسے واقعات وقوع پذیر ہوئے کہ حکومت ہند نے حیدرآباد میں حکومت کی تبدیلی پر اصرار شروع کیا۔ آخر کار 13/ ستمبر 1948ء کو حکومت ہند کی افواج نے گیارہ سمتوں سے حیدرآباد پر پیش قدمی کی۔ حیدرآبادی فوجوں اور رضاکاروں کی جانب سے تھوڑی بہت مزاحمت ہوئی لیکن 17/ ستمبر 1948ء کو حضور نظام نے اپنی افواج کو جنگ بندی کا حکم دے دیا۔

18/ ستمبر 1948ء کو ہندوستانی فوجیں میجر جنرل جے این چودھری کی قیادت میں سکندرآباد میں داخل ہوگئیں۔ نظم و نسق کے تمام امور میجر جنرل چودہری کے حوالے کر دیئے گئے اور انہیں وزیر اعلیٰ کے تمام اختیارات بذریعہ فرمان حوالے کر دیئے گئے۔

25/ جنوری 1950ء کو حکومت ہند اور حضور نظام کے درمیان ایک جدید معاہدہ کیا گیا جس کی رو سے حضور نظام کو وہ تمام مراعات وامتیازات جو 15/ اگست 1947ء سے قبل انہیں حاصل تھے جاری رکھے گئے۔

26/ جنوری 1950ء کو جب دستور ہند کا نفاذ عمل میں آیا تو ریاست حیدرآباد کا خصوصی موقف ختم ہوگیا اور دیگر ریاستوں کی طرح اس کو بھی ہندوستان کا ایک صوبہ قرار دے دیا گیا۔ حضور نظام بجائے مطلق العنان حکمران کے دستوری طور پر نگران حکومت یعنی راج پرمکھ بنائے گئے۔ اب حیدرآباد نے ایک نئے انقلاب کا سامنا کیا۔ 350 سالہ شاہی نظام کا خاتمہ ہوا اور حیدرآباد میں سلطانی جمہور کا دور دورہ ہوا۔ سلطنت آصفیہ کے آخری تاجدار نے نئے حالات کا خندہ

پیشانی سے خیر مقدم کر کے جمہوریت یعنی عوامی اقتدار اعلیٰ کو قبول کرلیا۔ حیدرآباد کی تاریخ کا ایک باب بحسن وخوبی ختم ہوا اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

20/ جون 1950ء کو حیدرآباد میں ایک عوامی حکومت تشکیل دی گئی جس کے سربراہ یعنی چیف منسٹر مسٹر ایم کے ولوڈی مقرر ہوئے جن کے ساتھ 8 وزراء نے حلف لیا۔ 21 ماہ بعد یعنی مارچ 1952ء میں جدید کابینہ نے مسٹر بی رام کشن راؤ کی قیادت میں حلف اٹھایا۔ (تذکرہ دربار حیدرآباد)

ریاست آندھرا پردیش اور حیدرآباد

31/ اکتوبر 1956ء کو ایک آرڈیننس کے ذریعہ ریاست حیدرآباد کا خاتمہ عمل میں لایا گیا۔ حضور نظام کی دستوری حیثیت ختم کردی گئی۔ راج پر مکھ کا عہدہ ختم کر دیا گیا چوں کہ لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیل جدید کی گئی تھی۔ اس وجہ سے ریاست حیدرآباد کو تین صوبوں میں بانٹ دیا گیا۔ ریاست حیدرآباد کے بجائے آندھرا پردیش کا قیام عمل میں لایا گیا۔ شہر حیدرآباد کو نئی ریاست کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ چناں چہ شہر حیدرآباد کی مرکزیت، اہمیت، وقار اور حیثیت بدلی ہوئی شکل میں ہی سہی قائم و برقرار رہی۔ تاحال یہ شہر ریاست کی راجدھانی ہے۔

وزیر اعظم ہند آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں "حیدرآباد شمالی ہند اور جنوبی ہند کو مربوط کرنے والا اہم ذریعہ اور ملک کے دونوں حصوں کو جوڑنے والی اہم کڑی ہے۔ اس شہر کی تہذیب، شرافت، رواداری، حسن وخوبی کے اعتبار سے اسے بجا طور پر ہندوستان کا دل مانا جاتا ہے

دارالحکومت

قطب شاہی خاندان کے پانچویں تاجدار سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اس شہر کو بسایا۔ اس وقت سے زوال سلطنت تک یہ شہر دارالحکومت رہا۔ 1687ء میں اورنگ زیب نے اس کی مرکزی حیثیت ختم کردی۔ سلطنت مغلیہ کے جنوبی پایہ تخت یعنی اورنگ آباد کی اہمیت اجاگر کرنے حیدرآباد کو اورنگ آباد کے تحت کر دیا۔ آصف جاہی خاندان کے عروج پر نظام الملک آصفجاہ دوم نواب میر نظام علی خاں نے دوبارہ حیدرآباد کو دارالحکومت قرار دے کر اس کی مرکزیت کو بحال کیا۔ گویا 65 برس کا درمیانی وقفہ ایسا رہا جس میں اس شہر کی صرف سیاسی اہمیت کم ہوئی لیکن تہذیبی نقطہ نظر سے اس کی حیثیت کبھی بھی کم نہ ہوسکی۔ آصف جاہ دوم کے بعد سے خاتمہ ریاست حیدرآباد تک شہر حیدرآباد دارالسلطنت رہا۔ عہد جدید میں جب کہ ریاست آندھرا پردیش کی تشکیل ہوئی۔

حیدرآباد ہی دارالحکومت ہے۔ چند برسوں پہلے حکومت ہند کے ارباب مجاز نے اس شہر کی جغرافیائی اور مرکزی حیثیت کو دیکھتے ہوئے ہندوستان کا صدر مقام بنا دینے پر بھی غور وخوض کیا تھا۔ اس بات سے اس شہر بختاور کی بے پناہ اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حیدرآباد کی بناوٹ

گولکنڈہ کے پانچویں تاجدار سلطان محمد قلی قطب شاہ نے 1000 ھ میں حیدرآباد کی بناڈالی۔ بہت جلد اس شہر نے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی حیثیت سے مرکزی مقام حاصل کرلیا۔ تاہم چند برس اس کی مرکزی حیثیت باقی نہ رہی کیوں کہ مغل سلطنت میں شمولیت کے بعد اورنگ آباد کو جنوب کا ہیڈکوارٹر بنادیا گیا۔ یہ صورت حال سلطنت آصفیہ کے آزاد اور خود مختار قیام تک برقرار رہی آصف جاہ دوم نے جب اورنگ آباد کے بجائے حیدرآباد کو دارالسلطنت قرار دیا تو شہر کی رونق اور عظمت رفتہ پلٹ آئی۔

حیدرآباد کی تعمیرات کے لئے گولکنڈہ سے چار میل دور جگہ کا انتخاب میر مومن نے کیا تھا۔ اس شہر کو فصیل بند نمونے پر بنایا گیا۔ چارمینار کو مرکز بناکر چار شاہراہیں تعمیر کی گئیں جن کے دونوں جانب 14000 دو منزلہ دکانیں تھیں جہاں مختلف اقسام کے سامان فروخت ہوتے تھے۔ شاہراہوں کے انقطاع کی وجہ سے یہ شہر چار حصوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ شمال مغربی حصے میں شاہی محلات، مشرقی حصے میں وزراء اور امراء کی کوٹھیاں تھیں۔ رعایا کے لئے دس مربع میل کے علاقے میں 12 ہزار مکانات کی تعمیر کی گنجائش تھی جہاں مدرسے، دواخانے، مساجد، سرائے، طعام خانے اور باغات کے علاوہ بازار کے لئے جگہ مختص کردی گئی تھی۔ علماء، مشائخ، اہل ہنر، مزدور اور مختلف طبقات کے لئے علحدہ حصے میں گنجائش فراہم کی گئی تھی۔ (احکم التاریخ)

آصف جاہی دور میں شہر حیدرآباد کی توسیع اور جدید تعمیرات کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ آصف جاہ دوم اور امراء سلطنت کے حیدرآباد آجانے کے باعث یہاں تیز رفتار ترقی ہونے لگی۔ نئے محل اور دیوڑھیوں کے علاوہ فوجی چھاؤنیاں بنائی گئیں۔ فرانسیسی افسروں کے لئے بھی کوٹھیاں تعمیر ہوئیں جن کے اطراف باغات لگائے گئے۔ (حیدرآباد کا تاریخی پس منظر)

حیدرآباد کی تعمیر کے ضمن میں سلطان قلی قطب شاہ کے علاوہ اس کے جانشینوں کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ حیدرآباد کی تعمیر و تزئین بہت سلیقہ سے کی گئی تھی۔ دریائے موسی پر پل کی تعمیر، مابعد چارمینار کی خوبصورت عمارت اس کے چاروں طرف شاہراہوں کی تعمیر، راستوں کے دونوں جانب دیدہ زیب عمارتوں کا سلسلہ، مساوی الاضلاع چوراہے، بازاروں کی ترتیب، دکانوں کی یکساں وضع قطع وغیرہ اس شہر کو قرون وسطی کے شہروں میں امتیاز بخشتے ہیں۔

محلات اور چند تعمیرات کو چھوڑ کر اکثر عمارتیں آج تک موجود ہیں۔ کاروان سرائے، دارالشفاء، چارکمانیں، گلزار حوض اور دیگر کئی یادگاریں قطب شاہی عہد کی یاد دلاتی ہیں۔ فرانسیسی سیاح ٹیوریز کا بیان ہے۔

"شہر نہایت سلیقے سے بنایا گیا ہے۔"

ولیم متھولڈ کہتا ہے۔

"یہ ہندوستان کا بہترین شہر ہے۔" (تاریخ گولکنڈہ)

حیدرآباد کی تزئین و سجاوٹ میں قطب شاہی سلاطین، مغل حکام اور آصف جاہی حکمرانوں کے ساتھ ساتھ امراء اور عوام کا ذوق اور سلیقہ شعاری نمایاں ہے۔

چار مینار

چار مینار گذشتہ ۴ صدیوں سے حیدرآباد کی پہچان بنا ہوا ہے۔ یہ ایک دیدہ زیب عمارت ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے حیدرآباد کی بنیاد اس عالی شان عمارت کی تعمیر کے ساتھ رکھی۔ چار مینار کی تعمیر کا آغاز 999 ھ میں ہوا۔ ایک سال کی مدت میں یہ عمارت تیار ہوئی۔ اس کی تکمیل کی تاریخ "یاحافظ۔ 1000 ھ" سے برآمد ہوتی ہے۔ چار مینار کی تعمیر گچ اور پتھر سے ہوئی۔ فرانسیسی سیاح تھیو چار مینار کو اپنی نوعیت کی منفرد عمارت قرار دیتے ہوئے پراثر انداز سے اس کا ذکر اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔

چار مینار کی عمارت مربع ہے۔ اس کے چاروں طرف چار سیدھی سڑکیں ہیں۔ چار مینار چار دیدہ زیب محرابوں سے مزین ہے۔ ان محرابوں کی بلندی 24 فٹ اور ہر کمان کی چوڑائی نیچے سے 30 فٹ ہے۔ درمیان میں ایک وسیع مربع دالان ہے۔ عمارت کے چاروں کونوں پر بارہ، بارہ پہلو کے چار خوبصورت مینار ہیں جن میں اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں موجود ہیں۔ بالائی عمارت دو منزلہ ہے۔ بیرونی حصہ خوشنما محرابوں سے آراستہ ہے۔ اوپری منزل پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ چاروں مینار پانچ درجوں میں منقسم ہیں۔ زمین سے ایک مینار کی بلندی 160 فٹ ہے۔ کمانوں اور پوری عمارت کے اندرونی اور بیرونی حصوں میں گل بوٹے، نقاشی اور "علم" کے اعلی فنی نمونے ملتے ہیں۔

چارمینار کی تعمیر پر 2 لاکھ ہن (نولاکھ روپے) کا خرچ آیا۔ مغل مہتم بہادردل خان کے عہد میں بجلی گرنے سے مغربی مینار منہدم ہوگیا تھا جس کی فوراً تعمیر کردی گئی۔ اس وقت صرف ایک مینار کی تعمیر و مرمت پر ساٹھ ہزار کا خرچ آیا تھا۔

نواب ناصرالدولہ کے عہد میں چارمینار پر چونے کی استرکاری کی گئی جس پر ایک لاکھ کا صرفہ ہوا۔ یہ چارمینار کی بناء کے 258 سال بعد کا واقعہ ہے۔ 1302ھ م 1884ء میں چارمینار پر سٹی پولیس کا ایک دستہ متعین کیا گیا۔ 2 سال بعد آہنی کٹھرا لگایا گیا۔ 1307ھ م 1889ء میں چارمینار پر چار گھڑیاں نصب کی گئیں۔

فصیل شہر

حیدرآباد کو ابتداءاً حصار بند نہیں کیا گیا تھا حالاں کہ حسب دستور کسی بھی سلطنت کا مرکزی شہر یا دارالسلطنت بغیر فصیل کے نہیں ہوا کرتا تھا۔ شہر حیدرآباد کی تعمیرات کی تکمیل کے عرصہ دراز بعد سلطان ابوالحسن تاناشاہ نے فصیل شہر کی جانب توجہ دی اور شہر کی حصار بندی کا کام شروع ہوا۔

فصیل کی تعمیر کا پہلا مرحلہ سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے دور میں پرانا پل سے دلی دروازہ تک اور دوسرا مرحلہ بعہد مبارزخاں عمادالملک (مغل حاکم) مکمل ہوا جو دہلی دروازہ سے دبیرپورہ دروازہ تک کی فصیل کی تعمیر پر مشتمل تھا۔ یہ فصیل سیدھی سادی تھی۔ اس پر کنگرے وغیرہ کچھ نہ تھے۔ بعد میں نواب آصف جاہ اول نے اپنے فرزند نواب صلابت جنگ کو شہر کی نامکمل فصیل کی تعمیر اور اس پر کنگرے کا التزام کرنے کا پابند کیا۔ یہ شہر کے اطراف فصیل کی تعمیر کا آخری مرحلہ تھا۔

شہر کی فصیل کی دوبارہ تعمیر سنگ بستہ کی گئی۔ حیدرآباد کے اطراف اس فصیل کی لمبائی 6 میل سے زائد تھی جس میں جگہ جگہ برج بنائے گئے جن پر توپیں نصب کی گئیں۔ اس فصیل میں 12 دروازے اور 12 کھڑکیاں بنائی گئیں۔ فصیل کے اندر کا حصہ اندرون شہر اور باہر کا حصہ بیرون شہر کہلاتا تھا۔

حیدرآباد کے دروازے

حیدرآباد کی حصاربندی کے بعد فصیل میں 12 دروازے لگائے گئے تاکہ حیدرآباد کا بیرون سے رابطہ رہے۔ بعد میں ایک اور دروازے کا اضافہ ہوا۔ ان دروازوں سے ہاتھی عماری کے ساتھ گذر سکتا تھا۔ رات کے وقت یہ دروازے بند ہوجاتے تھے اور صبح اولین ساعتوں میں کھول دیئے جاتے۔ بست وکشاد کے وقت توپ سر کی جاتی تھی اور دروازوں پر پہرہ ہوا کرتا تھا۔ دروازے یہ:

تھے۔

1۔ دہلی دروازہ　2۔ پرانا پل کا دروازہ　3۔ علی آباد کا دروازہ
4۔ دبیر پورہ کا دروازہ　5۔ لال دروازہ　6۔ فتح دروازہ
7۔ یاقوت پورہ کا دروازہ　8۔ گولی پورہ کا دروازہ　9۔ دودھ باولی کا دروازہ
10۔ چادر گھاٹ کا دروازہ　11۔ چمپا دروازہ　12۔ کنہ تالاب میر جملہ کا دروازہ
13۔ نیا پل کا دروازہ

اس وقت پورے شہر کی فصیل جگہ جگہ سے غائب ہے۔13 کے منجملہ صرف 2 دروازے بطور یادگار ماضی باقی ہیں۔

کھڑکیاں

حیدرآباد کی آبادی میں روز افزونی کے باعث لوگوں کو آمد ورفت کے لئے رات کے وقت دشواریاں ہونے لگیں تو اوقات شب میں کھڑکیاں کھلی رکھی جانے لگیں جو دروازوں سے کسی قدر چھوٹی اور تنگ ہوتی تھیں۔ میت کو دروازوں کے بجائے کھڑکیوں سے لایا لے جایا جاتا تھا۔ ان کھڑکیوں سے ہاتھی کے سوا تمام سواریاں آسانی سے گذر سکتی تھیں۔ کھڑکیوں پر بھی پہرہ ہوا کرتا۔ فصیل کے توڑے جاتے وقت دروازوں کے ساتھ کھڑکیاں بھی نکال دی گئیں۔ ان کھڑکیوں کو دریچہ بھی کہا جاتا ہے۔ان کی تفصیل یہ ہے۔

1۔ رنگ علی شاہ کی کھڑکی　2۔ بودے شاہ کی کھڑکی　3۔ میر جملہ کی کھڑکی
4۔ ماماتا کی کھڑکی　5۔ بوہیر کی کھڑکی　6۔ کلالہ کی کھڑکی
7۔ چار محل کی کھڑکی　8۔ چمپا دروازہ کی کھڑکی　9۔ کہاروں کی کھڑکی
10۔ گاذر کی کھڑکی　11۔ حسن علی کی کھڑکی　12۔ دارالشفاء کی کھڑکی

بعض کھڑکیوں کے ایک سے زائد نام بھی تھے۔

حیدرآباد کی کمانیں

حیدرآباد کی تعمیرات میں اسلامی طرز تعمیر اور ایرانی مزاج نمایاں ہے۔ بعض میں ہندوستانی، دکنی اور اسلامی امتزاج ملتا ہے۔ محرابوں اور کمانوں کی تعمیرات ایرانی اثرات کے مظہر ہیں۔ حیدرآباد کی چند مشہور کمانیں یہ ہیں۔

1- چارکمان 2- مچھلی کمان 3- سحر باطل کمان 4- کالی کمان 5- انصاری کمان (ہری باولی) ایلچی بیگ کی کمان (دریچہ ماتا) ساجدہ بیگم کی کمان (مغل پورہ) حسینی علم کمان (حسینی علم) محمد شکور کی کمان (فتح دروازہ) سوق میر کی کمان (دودھ باولی) شمس الامراء کی کمان (شاہ گنج) شیخ فیض کی کمان (یاقوت پورہ) مکرم الدولہ کی کمان (اردو شریف) حظیرہ کمان (مشیرآباد) صاحب کی کمان (کارروان)

حیدرآباد کے حوض

حوض اسلامی تعمیرات کی خصوصیات میں شامل ہے۔ خاص طرز کے حوضوں کی تیاری میں مسلمان معمار جواب نہیں رکھتے۔ حیدرآباد کے محلات اور دیوڑھیوں کے علاوہ مساجد اور باغات میں حوضوں کا وجود ناگزیر تھا۔ چند مشہور و معروف حوض یہ ہیں۔

گلزار حوض، کٹورا حوض (گولکنڈہ)، جڑواں حوض، لنگر حوض اور رائے آہنی کا حوض وغیرہ۔

حیدرآباد کی شاہراہیں

حیدرآباد کا روڈ سسٹم ابتداء ہی سے ترقی یافتہ مانا گیا ہے۔ شہر کی تعمیرات اور شاہراہوں کی تیاری بہت منصوبہ بند طریقے پر کی گئی تھی۔ سلطنت گولکنڈہ اپنی عظیم شاہراہوں کے سبب بے حد مشہور تھی۔ سارے ملک کا حیدرآباد سے رابطہ کا یہ کارآمد وسیلہ حیدرآباد کو عظیم الشان تجارتی منڈی بنانے میں ممد و معاون بنا۔ سال بھر سوداگروں اور سیاحوں کی آمد و رفت حیدرآباد کی اہمیت بڑھانے میں اپنا حصہ لیتی رہی۔

حیدرآباد کی شاہراہیں پڑوسی سلطنتوں اور علاقوں سے پوری طرح مربوط تھیں۔

حیدرآباد کے پل

شہر حیدرآباد رود موسیٰ کے کنارے آباد ہے۔ ابتداءً یہ شہر ندی کے مشرقی کنارے آباد کیا گیا تھا بعد میں وسعت اختیار کرنے لگا اور مغربی کنارے پر بھی دور دور تک شہر کے حدود پھیل گئے۔ شہر کے ان دونوں حصوں کو ملانے کا کام موسیٰ ندی پر تعمیر کردہ پل انجام دیا کرتے ہیں۔

پرانا پل

پرانا پل، حیدرآباد کی تاسیس سے 14 سال قبل تعمیر ہوا۔ اس دور میں اس نوعیت کے پل پورے ہندوستان میں کہیں کہیں بنے ہوئے تھے۔ پرانا پل ایسے مقام پر تعمیر ہوا جہاں سے چارمینار اور گولکنڈہ کا تقریباً یکساں فاصلہ ہے۔ اس کی بناء سلطان ابراہیم قطب شاہ نے 981 ھ میں

رکھی۔5 سال کی مدت میں تعمیر مکمل ہوئی۔ پرانا پل کا مادہ تاریخ صراط المستقیم 981 اور تاریخ تکمیل گذر گہہ 986 برآمد ہوتی ہے۔ تعمیر پر 2 لاکھ پچاس ہزار کا صرفہ ہوا۔

چادر گھاٹ پل

حیدرآباد کا دوسرا قدیم پل چادر گھاٹ پل ہے۔ یہ پل عیسی میاں بازار سے اعظم پورہ کے درمیان چادر گھاٹ پر بنا ہوا ہے۔ نواب ناصرالدولہ آصف جاہ رابع نے 85 ہزار کے صرفہ سے 1831ء میں اس کی تعمیر کی۔ اس پل پر ایک کتبہ بھی ہے۔

نیا پل

اس پل کا نام افضل پل ہے لیکن نیا پل سے شہرت رکھتا ہے۔ موسی ندی پر بنایا جانے والا یہ تیسرا پل ہے۔ اس کی تعمیر نواب افضل الدولہ بہادر کے حکم سے 1859ء میں ہوئی پل پر ایک کتبہ بھی ہے۔ یہ پل پرانے شہر اور نئے شہر کو جوڑنے والا اہم وسیلہ ہے۔

مسلم جنگ پل

نواب غالب الملک نے اپنے ذاتی صرفہ سے موسی ندی پر پرانا پل اور نئے پل کے محاذی اس پل کو لاکھوں کے صرفہ سے 1311ھ سے 1318ھ جملہ 7 سال کی محنت سے تیار کروایا۔

سالار جنگ پل

کروڑہا روپوں کے خرچ سے دارالشفاء سے گولی گوڑہ کے درمیان نئے پل اور چادر گھاٹ پل کے محاذی اس پل کی تیاری ہوئی۔ اس کی تیاری میں 7 سال لگے۔ پائیداری میں یہ قدیم پلوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تاہم ٹریفک کا بڑا مسئلہ حل ہوا۔

جدید پل

پرانا پل کے بالکل متصل ایک جدید پل بنایا گیا ہے اس پل کے سبب بھاری گاڑیوں اور بے پناہ ٹریفک جس کی وجہ سے پرانا پل پر جو بھاری بوجھ تھا کم ہوا ہے۔ یہ پل 5 سال کی شبانہ روز محنتوں سے کروڑہا روپے کے صرف سے بلدیہ حیدرآباد کی نگرانی میں تیار ہوا۔ اس پل کی تیاری میں میئر بلدیہ جناب میر ذوالفقار علی صاحب کی کوششوں کو بڑا دخل رہا۔

حیدرآباد کے ان چھ بڑے پلوں کے علاوہ جو رود موسی پر تعمیر ہوئے ہیں چند اور پل بھی

مشہور ہیں۔ مثلاً لکڑی کا پل، نیموخاں کا پل اور بے شمار نالوں اور ریلوے لائنوں پر بنائے گئے برج

بیگم پیٹ برج

امیرپیٹ اور بیگم پیٹ کے درمیان ریلوے لائن کے اوپر ایک اوور برج تعمیر کیا گیا ہے جس سے حیدرآباد اور سکندرآباد کے درمیان بھاری ٹریفک کو بڑی سہولتیں مہیا ہوئیں۔

دبیرپورہ اوور برج

دبیرپورہ ریلوے گیٹ کے اوپر زیر تعمیر اوور برج سے پرانے شہر کی ٹریفک کو بڑی راحت ملے گی۔

ان کے علاوہ مضافات میں تعمیر شدہ اوور برجس سے ٹریفک کے مسائل حل ہوئے ہیں۔

حیدرآباد کے تالاب

قطب شاہی عہد میں گولکنڈہ اور حیدرآباد میں آبرسانی کا انتظام بے حد مستحکم اور ترقی یافتہ تھا۔ کئی ذخائر آب بنائے گئے تھے۔ ان تالابوں میں سب سے اہم حسین ساگر ہے۔

حسین ساگر

سلطان ابراہیم قطب شاہ نے حضرت حسین شاہ ولی کی نگرانی میں ۹ لاکھ کے صرفہ سے حسین ساگر بنوایا۔ اس کا قدیم نام ابراہیم ساگر تھا لیکن بعد میں حسین ساگر سے مشہور ہوا۔ حیدرآباد والوں کو اس کا پانی سربراہ کیا جاتا تھا۔ بعد میں زرعی ضرورتوں کی اس کے پانی سے تکمیل کی جانے لگی۔

تالاب میر جملہ

گولکنڈہ کے میر جملہ مرزا محمد امین نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں تالاب چپلم کی جگہ اس کو بنایا۔ اس کا کٹہ بے حد مضبوط بنایا گیا۔ اس میں برسات کا پانی جمع ہوتا تھا۔

تالاب ماں صاحبہ

حیدرآباد کے قدیم تالابوں میں سے ہے اس کو سلطان محمد قلی قطب شاہ کی ماں خانم آغا نے بنوایا تھا۔ اس تالاب کے پہلو سے بنجارہ ہلز کا راستہ نکلتا ہے۔ تالاب کے کتوہ کے دونوں جانب

برجیاں تھیں جن پر کتبے نصب تھے۔ اس کا سنہ تعمیر 1037ھ ہے۔

تالاب میر عالم

شمس آباد شاہراہ پر واقع ہے جسے نواب میر عالم نے 1805ء میں ایک فرانسیسی انجنئر کی نگرانی میں بنوایا۔ اس تالاب کا باندھ 3360 فٹ طویل اور جملہ رقبہ 8 میل پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی تعمیر پر 22 لاکھ روپے خرچ کئے گئے۔ عرصہ دراز تک حیدرآباد کی آبادی کے بڑے حصہ کو اس تالاب سے پانی سربراہ کیا جاتا رہا۔

افضل ساگر

نواب افضل الدولہ بہادر آصف جاہ خامس کے نام سے معنون یہ تالاب آصف نگر علاقہ میں واقع ہے۔ اس تالاب سے آبرسانی اور آبپاشی دونوں ضرورتوں کی تکمیل ہوتی رہی۔ آج کل یہ تالاب خشک ہو گیا ہے اور خاص تالاب میں کئی مکان بن گئے ہیں۔

عثمان ساگر

عثمان ساگر موضع گنڈی پیٹ میں واقع ہے۔ 1908ء کی تباہ کن طغیانی کے بعد ایک ایسے باندھ کی ضرورت محسوس کی گئی جس سے سیلاب کی تباہ کاریوں پر قابو پایا جاسکے۔ اس کی تعمیر کا شاہی فرمان 17/ اگست 1911ء کو جاری ہوا۔ اس کا باندھ دو میل طویل ہے۔ اس تالاب کی تعمیر پر 54 لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ حیدرآباد کے لئے پانی عثمان ساگر سے سربراہ کیا جاتا ہے۔ آج کل دوسرے ذخائر سے بھی شہریوں کے لئے پانی حاصل کیا جارہا ہے۔

حمایت ساگر

عثمان ساگر سے 2 میل کے فاصلہ پر حمایت ساگر بنایا گیا۔ اس کی تعمیر پر 92 لاکھ روپے کا صرفہ ہوا۔ اس پر ایک مضبوط باندھ بنایا گیا ہے۔ اس تالاب سے بھی شہر کو پانی سربراہ ہوتا ہے۔

حیدرآباد کی باولیاں

پانی قدرت کا عظیم عطیہ ہے۔ حیدرآباد والوں کو ہمیشہ ہی اس نعمت کا وافر حصہ ملا۔ پانی کے مختلف ذرائع ہیں جن میں چشمہ، کنواں اور باولی قدرتی وسائل ہیں۔ حیدرآباد کے ہر گھر میں باولی کا ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ جن گھروں میں باولی نہیں ہوتی وہاں کہار اور بہشتی پانی سربراہ کرتے۔

بعد میں تالابوں سے پانی سربراہ ہونے لگا۔ گھریلو باولیوں کے علاوہ جگہ جگہ بڑی چھوٹی پختہ سنگ بستہ باولیاں تھیں۔ موسم گرما میں پیراکی کے شائق بچے بڑے ان باولیوں پر ہجوم کیا کرتے تھے۔ دن بھر تیرنے والوں کی وجہ سے چہل پہل رہا کرتی۔ حیدرآباد کی چند مشہور باولیوں کے نام یہ ہیں۔

آغافرہاد کی باولی (جل پلی) ایرما باولی (قطبی گوڑہ) بچے والی باولی (چنچل گوڑہ) پاپڑو باولی (برہمن واڑی) پتھر گھسو باولی (الاوہ یتیماں) سنکھے کی باولی (فتح دروازہ) حمام باولی (لال دروازہ) دودھ باولی، ہری باولی، رنگی باولی، مگر کی باولی، گوند کی باولی، پٹیل کی باولی، صاحب کمان باولی، غوثیہ باغ کی باولی، زرگروں کی باولی، دھیڑوں کی باولی، کھاری باولی، کنڈالہ باولی، گندی باولی، گنگا باولی، مرغ خانہ باولی، کلے باولی، موسی باولی، نانک باولی، ہاتھی باولی، ہرن باولی، اندھیری باولی، جڑواں باولی، حجام باولی مچھلی باولی، سنکسیر باولی وغیرہ۔

حیدرآباد کے باغات

حیدرآباد میں باغات کا عام رواج تھا۔ یہاں سینکڑوں باغ موجود تھے۔ باغ بانی کی خوشگوار عادت حیدرآبادیوں کو اپنے گھروں، دیوڑھیوں اور محلات میں خانہ باغ لگانے پر مجبور کرتی تھی۔

باغ عامہ

حیدرآباد کا وسیع تر اور خوبصورت باغ فتح میدان کے راستہ پر باغ عامہ کے نام سے موسوم ہے۔ زمانہ قدیم میں یہاں بالکشن باغ تھا بعد میں یہ محبوب باغ سے مشہور ہوا۔ 1867ء میں اس کی از سر نو تعمیر ہوئی اور اس کا سلسلہ 10 سال چلتا رہا۔ اس میں ایک آہنی بنگلہ تھا۔ 1899ء میں ایڈریس پلیٹ فارم بنا۔ 1905ء میں دربار ہال کی تعمیر ہوئی۔ جوبلی ہال اور آندھراپردیش اسمبلی باغ عامہ کی زینت ہیں۔

باغ عامہ میں آثار قدیمہ کا میوزیم، بال بھون، مسجد، تالاب اور خوبصورت سبزہ زار ہیں۔

حیدرآباد میں واقع سینکڑوں باغات کے منجملہ چند قدیم و جدید باغات کے نام یہ ہیں۔

اکبر باغ، بشیر باغ، گل باغ، جام باغ، نانا باغ، رام باغ، سیتارام باغ، لنگم پلی باغ، بونن پلی باغ انجیر باغ، امین باغ، ابراہیم باغ، باغ صفا، بسنت گیر باغ، بخشی باغ، بھولاناتھ باغ، عنبرپیٹ باغ، پھول باغ، رام چندر نارائن باغ، رحمت باغ، رشید الدولہ باغ، غنی یار جنگ باغ، مرلیدھر باغ، محی الدین پاشاہ باغ، حیدر باغ، مسلم جنگ باغ، منیر جنگ باغ، غوثیہ باغ، سلطان باغ، لکشمی داس باغ، مسکین شاہ باغ، زیبا باغ، شنکر باغ، دیوی باغ، چندن باغ، موسی باغ، مولی باغ، کیلاش باغ، پرتاپ باغ، مانک رام باغ، جہاں آرا باغ، کشن باغ، عثمان باغ، شرفی چمن باغ،

فریدوں جاہ باغ، گوبند باغ، حسین لقا باغ، عمدہ بیگم باغ وغیرہ۔

پارک

نہرو زوالوجیکل پارک، ونستھلی پورم پارک، اندرا پارک، سنجیویا پارک اور روٹری کے علاوہ 200 عام پارک محکمہ بلدیہ کی زیر نگرانی قائم ہیں۔

چمن

بلدیہ حیدرآباد کے 200 سے زائد چمن حدود شہر میں موجود ہیں۔ چند قدیم چمن یہ ہیں۔ افضل گنج چمن، چادر گھاٹ چمن، مغل پورہ چمن، گولی گوڑہ چمن اور برکت پورہ چمن وغیرہ۔

حیدرآباد کے محل

سلاطین حیدرآباد کو تعمیرات سے فطری دلچسپی تھی اسی وجہ سے یہاں خوبصورت محلات، عالیشان عمارتوں اور بے مثال تعمیرات کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ چند قابل ذکر محل یہ ہیں۔

قطب شاہی عہد کے محل

محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تعمیر شدہ محلوں میں سب سے رفیع الشان محل خداداد محل تھا۔ یہ آٹھ منزلوں پر مشتمل تھا۔ ہر منزل کا علحدہ نام تھا۔ اس کی خوبصورتی اور آرائش دیدہ زیب تھی۔ خداداد محل کی آٹھ منزلیں موسوی محل، جعفری محل، حسینی محل، حسنی محل، حیدری محل، محمد محل، الٰہی محل سے موسوم تھیں۔ یہ نام سلطان کے مذہبی رجحان کے آئینہ دار ہیں۔

دیگر محل یہ تھے جو سب کے سب قطب شاہوں کے ذوق سلیم اور نفیس مزاج کے غماز تھے۔ اعلیٰ محل، سجن محل، مشک محل، حیدر محل، قطب مندر، چندن محل، لگن محل، حنا محل، داد محل، ندی محل، کوہ طور محل، امان محل، محل بنات گھاٹ وغیرہ۔ ان محلوں کے علاوہ چارمینار کے شمال مغربی سمت دولت خانہ عالی بنایا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف چار کمانیں اور جلوخانہ کے وسط میں ایک خوبصورت ہشت پہلو حوض تھا۔

آصف جاہی عہد کے محل

نواب صلابت جنگ نے چارمینار سے قریب چار محل تعمیر کئے جنہیں چو محلہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ محل 1750ء میں بنائے گئے جو مختلف اغراض کے لئے زیر استعمال رہے۔ دربارہال،

ایوان ملاقات، شاہی دفاتر کے علاوہ بادشاہ کی رہائش کے لئے یہ محل مختص تھے۔ چو محلہ میں داخلہ کے لئے لاڈ بازار میں جلوخانہ کی کمان اور داخلی دروازہ سے گذرنا پڑتا تھا۔ چو محلہ کے اطراف بلند حصار اور درمیان میں عالیشان باغ تھا۔ یہ پورا علاقہ 13 لاکھ مربع گز پر مشتمل تھا۔

چو محلہ کے حصار کے اندر مختلف اوقات میں سلاطین آصف جاہی نے نئے محل بنواکر اضافہ کیا جو مختلف طرز تعمیر کے اعلیٰ نمونے پیش کرتے ہیں۔ آصف جاہی عہد میں اس علاقہ کو خلوت مبارک سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس شاہی کامپلکس میں 8 شاندار محل تھے۔ چو محلہ، پنج محلہ، خلوت مبارک، رنگ محل، روشن بنگلہ، تہنیت محل، افضل محل اور آفتاب محل۔ شاہی خاندان کے ارکان کی رہائش گاہوں پر مشتمل عمارتیں اپنی آرائش اور سجاوٹ کے لحاظ سے بے مثال تھیں۔ خلوت کامپلکس میں چند عمارتیں ان اسماء سے مشہور تھیں۔ موتی بنگلہ، سردار بنگلہ، شادی خانہ اور توشہ خانہ وغیرہ۔

فلک نما

فلک نما پیلیس حیدرآباد کا بے حد خوبصورت عالیشان اور متاثر کن محل ہے۔ اس محل کو نواب وقارالامراء اقبال الدولہ بہادر نے چالیس لاکھ کے صرفہ سے 1894ء میں تیار کیا۔ نواب میر محبوب علی خاں نے اس محل کو پسند کرکے اخراجات کی ادائیگی کے بعد خرید لیا۔ یہ محل 300 ایکڑ اراضی پر بنا ہے۔ مشرقی و مغربی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔ نظام ششم نے اس محل میں 1911ء میں انتقال کیا۔

جہاں نما

فلک نما پیلیس سے قریب سر آسمان جاہ نے جہاں نما پیلیس بنوایا۔ اس کی تعمیر میں فنی کمال جھلکتا ہے۔

خورشید جاہ پیلیس

چو محلہ سے قریب سر خورشید جاہ نے اپنا محل بنوایا۔ یہ محل بھی اپنی وضع بناوٹ اور خوبصورتی میں بے مثال ہے۔

عشرت محل

عشرت محل بھی سر خورشید جاہ بہادر کا تعمیر کردہ ہے۔ اس میں پائیگاہ کے دفاتر تھے۔

بشیر باغ پیلیس

سر آسمان جاہ بہادر نے بشیر باغ میں ایک محل بشیر باغ پیلیس کے نام سے بنایا۔ اس کی تعمیر 1868ء میں ہوئی۔ چار لاکھ کا خرچ ہوا۔

محل وقار الامراء

امیر پائیگاہ نواب سر وقار الامراء نے کئی محل بنوانے جو بیگم پیٹ اور پنجہ گٹہ میں واقع ہیں۔ انہیں تعمیرات کا بے حد شوق تھا۔ اس فن میں اپنی مہارت، حوصلہ مندی اور سلیقہ کا بھرپور اظہار کرتے تھے۔

حیدرآباد کی حویلیاں

حیدرآباد میں سلاطین اور امراء کی بنائی ہوئی عالی شان عمارتیں ان کے ذوق سلیم کا پتہ دیتی ہیں۔ ان شاہی عمارتوں اور امراء کی تعمیرات کئی ناموں سے پہچانی جاتی ہیں جن میں محل، حویلی، دیوڑھی اور کوٹھی وغیرہ ہیں۔

پرانی حویلی

دارالشفاء کے مشرقی حصہ میں آصف جاہ ثانی کا قدیم محل پرانی حویلی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ دو عظیم الشان محلوں پر مشتمل شاہی کامپلکس ہے۔ اس کو نواب رکن الدولہ بہادر نے بنوایا تھا جسے نظام دوم نے حاصل کرلیا۔ یہاں پر ابتداءً نواب سکندر جاہ کا قیام رہا۔ آصف جاہ ثانی و ثالث نے ان محلوں کی تزئین نو اور آرائش میں بے حد مبالغہ سے کام لیا۔ جب نواب سکندر جاہ یہاں سے خلوت منتقل ہوگئے تو اس کا نام پرانی حویلی پڑ گیا۔ اس کا جملہ رقبہ ایک لاکھ پینتالیس ہزار مربع گز ہے۔ سکندر جاہ کا بنایا ہوا آئینہ خانہ اور چینی خانہ ہے۔ نظام ششم نے بھی کئی اضافے کئے۔

دیگر حویلیاں

خلوت کے شاہی کامپلکس میں جو دو زنانی محل تعمیر ہوئے انہیں منجھلی بیگم کی حویلی اور چاندنی بیگم کی حویلی سے موسوم کیا گیا۔

امرا پائیگاہ اپنی حویلیاں شاہی محلات سے قریب تعمیر کرتے تھے۔ چو محلہ کے قریب مشہور و معروف حویلیوں میں سر آسمان جاہ، سر خورشید جاہ اور سر وقار الامراء کی حویلیاں ہیں۔

آسمان گڑھ کی خوبصورت حویلی ملک پیٹ کے آخری حدود میں بنائی گئی تھی۔ یہ انگریزی طرز

تعمیر کی خوبصورت عمارت ہے۔

کنگ کوٹھی

کنگ کوٹھی نواب کمال خاں کے ذوق تعمیر کا نمونہ ہے جسے آصف جاہ سابع نے اپنی رہائش کے لئے خرید لیا اور اس کے احاطہ میں کئی جدید عمارتوں کا اضافہ کیا۔ آصف سابع اس کوٹھی میں 16 سال کی عمر سے رہائش پذیر رہے۔

رزیڈنسی

یہ برطانوی ریذیڈنٹ کی کوٹھی ہے۔ فن تعمیر کے لحاظ سے بے مثال اور نہایت عمدہ عمارت ہے۔ اس کی تعمیر ایک انگریز انجنئر کی زیر نگرانی ہوئی جو شاہی ملازم ہو گیا تھا۔

حیدرآباد کی دیوڑھیاں

حیدرآباد کے جاگیرداروں، منصب داروں اور شاہی انعام یافتگان کی رہائش گاہیں دیوڑھی کہلاتی ہیں۔ محل، حویلی اور دیوڑھی میں تعمیری اور فنی امتیاز یقیناً ہوگا مگر حیدرآباد میں دیوڑھی کی مروج تعریف ہی کافی ہے۔

دیوان دیوڑھی

نواب عبد القاسم میر عالم بہادر نے دیوان دیوڑھی بنوائی۔ بعد میں اس کو نواب منیر الملک نے حاصل کیا۔ ان کے بعد یہ دیوڑھی سر سالار جنگ اول کے زیر تصرف رہی۔ یہ تینوں وزراء اعظم رہ چکے تھے جنہیں دیوان کہا جاتا تھا۔ اسی مناسبت سے ان کی قیام گاہ کا نام دیوان دیوڑھی پڑ گیا۔

ہر دیوان نے اس دیوڑھی کے احاطے میں کچھ نہ کچھ تعمیری اضافہ کیا۔

دیگر دیوڑھیاں

حیدرآباد کے بے شمار جاگیرداروں اور روساء کی دیوڑھیاں شہر کی رونق اور تمدنی اہمیت میں اضافہ کا باعث تھیں۔ چند مشہور دیوڑھیوں کے نام یہ ہیں۔

اقبال الدولہ کی دیوڑھی، خورشید جاہ کی دیوڑھی، راجہ شیوراج بہادر کی دیوڑھی، راجہ شام راج کی دیوڑھی، سلطان نواز جنگ کی دیوڑھی، مہاراجہ کشن پرشاد کی دیوڑھی، بنسی راجہ کی دیوڑھی، رانے رایاں کی دیوڑھی، راؤ رنبھا کی دیوڑھی، دلیے خاں نواب کی دیوڑھی، شمشیر جنگ کی دیوڑھی، لقمان

الدولہ کی دیوڑھی، نواب تہور جنگ کی دیوڑھی، سیف نواز جنگ کی دیوڑھی، فخرالملک کی دیوڑھی، برق جنگ مغل صاحب کی دیوڑھی، وزیر علی بادشاہ کی دیوڑھی، شہامت جنگ ںی دیوڑھی، مبارک محل دیوڑھی، گونگے نواب کی دیوڑھی، معین الدولہ کی دیوڑھی، فقیر پاشاہ کی دیوڑھی، گنج نواب کی دیوڑھی، صمصام الملک کی دیوڑھی، ذوالفقار الدولہ کی دیوڑھی، شہید یار جنگ کی دیوڑھی، نظامت جنگ کی دیوڑھی، واحد نواز جنگ کی دیوڑھی وغیرہ وغیرہ۔

...

حیدرآباد کے محلے

بانی شہر کے حکم سے رعایا کے لئے حیدرآباد میں سینکڑوں محلے اور ہزاروں مکانات نہایت ترتیب اور سلیقہ سے بنائے گئے تھے۔ ان محلوں کے نام گذشتہ چار صدیوں میں جانے کتنی مرتبہ تبدیل ہوئے ہیں۔

حیدرآباد کے محلوں کے نام مختلف ادوار میں اپنے لاحقوں اور سابقوں کے ساتھ مخصوص انداز کے رہے ہیں۔

عہد قطب شاہی کے لاحقے

آباد، باغ، بن، چوک، چوکی، گلی، ہاٹ، حوض، میدان، محل، پہاڑ، پہاڑی، پیٹ، پورہ، شاہ، شاہی۔

آصف جاہی عہد کے لاحقے

آباد، اڈہ، باغ، بن، باولی، بارہ دری، بستی، بازار، بیلہ، بنڈہ، برج، چبوترہ، چمن، چاوڑی، دیوڑھی، گلی، گوڑہ، گنج، گنہ، گٹی، حویلی، کھڑکی، کوچہ، کوٹھی، کونلہ، منڈی، میٹ، کنٹہ، محل، میدان، محلہ، نگر، ناکہ، نما، پلی، پیٹ، پورہ، شاہی، ٹیکری، ٹنی اور واڑی وغیرہ۔

جدید لاحقے

کنٹہ، مارگ، نگر، پلی، پورہ، پورم وغیرہ۔

سکندرآباد

حیدرآباد سے 6 میل کے فاصلہ پر انگریزی فوجی چھاونی تھی۔ یہاں پر برطانوی حکام نے منصوبہ بند شہر بسایا۔ نواب سکندر جاہ بہادر کے نام پر سکندرآباد نام رکھا گیا۔

چند اہم محلے

آصف نگر۔ حیدرآباد کا قدیم محلہ ہے جو حصار بند تھا۔ یہاں زیبا باغ اور فیل خانہ تھا۔

خیریت آباد۔ قطب شاہی عہد کا محلہ خیریت النساء بیگم کے نام سے مشہور ہے۔ اسی محلہ میں حسین ساگر بنایا گیا۔

مغلپورہ۔ مغل لشکر کے پڑاؤ کے سبب مغلپورہ مشہور ہوا۔ حیدرآباد کے امراء و مشاہیر کا محلہ ہے۔

شاہ علی بنڈہ۔ قدیم محلہ ہے۔ امراء کی دیوڑھیوں کے سبب مشہور ہے۔

سلطان شاہی۔ تالاب میر جملہ سے متصل ایک قطب شاہی وزیر کا آباد کردہ ہے۔

دبیرپورہ۔ قدیم اور وسیع محلوں میں سے ایک ہے۔ مشہور عاشورہ خانہ بی بی کا الاوہ یہیں ہے۔

کاچیگوڑہ۔ کاچیوں (مچھیروں) کی بستی تھی۔ یہیں پر ریلوے اسٹیشن بنایا گیا۔

کاروان۔ قطب شاہی عہد کی کارواں سرائے تھی۔ ہر دور میں بے حد آباد محلہ رہا ہے۔

حسینی علم۔ حیدرآباد کا قدیم گنجان اور بارونق محلہ ہے۔ عاشور خانہ حسینی علم کے سبب مشہور ہے۔

بیگم پیٹ۔ آصف جاہ ثانی کی دختر کے جہیز میں دیئے گئے مواضعات میں سے ہے۔ یہاں رصد گاہ تھی۔

سرونگر۔ نواب سر آسمان جاہ کی حویلی اور شاہی شکار گاہ کے سبب مشہور ہے۔

چنچل گوڑہ۔ حیدرآباد کا قدیم محلہ ہے۔ سرکاری جیل خانہ اسی محلہ سے متصل ہے۔

ملک پیٹ۔ قدیم آبادی ہے۔ شاہی محلوں اور شاہی اصطبل کے سبب مشہور ہوا۔

مشیرآباد۔ قطب شاہی عہد سے آج تک نہایت گنجان اور آباد محلہ ہے۔ شاہی مسجد کے سبب مشہور ہے۔

چادرگھاٹ۔ ایک علحدہ بلدی زون تھا۔ آج بھی گنجان اور مصروف محلہ ہے۔

حمایت نگر۔ جدید محلوں میں زیادہ پسندیدہ علاقہ ہے۔ 1930ء میں پرنس آف برار سے موسوم کیا گیا۔

سیف آباد۔ یہاں سیف آباد محل تھا جس میں آج کل حکومت کے دفاتر معتمدین قائم ہیں۔ اعلی طبقہ رہتا تھا۔

رزیڈنسی۔ انگریز رزیڈنٹ کی کوٹھی کے سبب مشہور ہے۔ گنجان اور بیرونی آبادی والا محلہ ہے۔

حیدرگوڑہ۔ حیدر علی تعلقدار سے موسوم ہے۔ حیدرآباد کے اعلی طبقہ کے لوگ رہتے ہیں۔

اردو شریف۔ کام بخش کے فوجیوں کے قیام کے سبب مشہور ہے۔ یہاں گنجان آبادی ہے۔

لالہ گوڑہ۔ یہ موضع تھا۔ محل نواب نظام علی خاں نے ترقی دی۔ ایک محل تعمیر کیا۔ بے حد آباد محلہ ہے۔

دیگر محلے

۱۔ احمد محلہ، اردو شریف، اعتبار چوک، افضل خاں محلہ، املی بن، آبدار خانہ ابن صاحب، آنند محل۔

انورپورہ ، آہک پورہ ، ایرناگنٹہ ، امیرپیٹ ، آصف نگر ، احمد نگر ، امان نگر ، اکناپیٹ ، اونٹ واڑی ، اڈیکمیٹ ،اعظم پورہ،اشوک نگر،آسمان محل،الاوہ بیج بھائی۔

ب۔ ببری الاوہ، بجڑمل محلہ ، براق پنجھی ، بروز محلہ ، برہمن واڑی ، برہنہ شاہ درگاہ ، بگل کنٹہ ، بنڈل گوڑہ ، بہادرپورہ ، بخش بنڈہ ، بگڑہ محلہ ، بھاجی منڈی ، بھانڈ پورہ ، بھانڈ محلہ ، بھڑبھڑ نالہ ، بھونی گوڑہ ، بی بی کا الاوہ ، بیت المعذورین ، بید رواڑی ، بیگاریاں ، بیگاری گوڑہ ، بگی خانہ ، بیگم پیٹ ، بیلہ ، بالسٹی کھیت ، بھالدار واڑی ، برکت پورہ ، بالمیکی نگر ، بارہ گلی ، بورہ بنڈہ۔

پ۔ پالم ، پٹھان واڑی ، پل قدیم ، پلٹن اول ، پنجہ شاہ ، پنجہ گٹہ ، پنج محلہ ، پنی پورہ ، پھسل بنڈہ ، پٹلہ برج ، پیم چند ، پتھر گٹی ، پہاڑی بابا صاحب ، پہاڑی میر مومن ، پولیس کوارٹرس۔

ت۔ تاڑبن ، تعلیم عملہ پور ، تعلیم شرزہ ، تغاری ناکہ ، توناگوڑہ ، تلجاگوڑہ ، تازلہ بستی ، تلجارام۔

ٹ۔ ٹپہ چبوترہ ، ٹولی چوکی ، ٹکسال

ج۔ جٹ پورہ ، جعفر گوڑہ ، جل پلی خزانہ ، جنگلی و ٹھوبا ، جنگم میٹ ، جوڑواں حوض ، جوشی واڑہ ، جہاں نما ، جھگڑ بستی ، جہانگیر واڑی ، جیاگوڑہ۔

چ۔ چادر محلہ ، چار محل ، چار مینار ، چاکناواڑی ، چنگنی پورہ ، چمپادروازہ ، چھتا محل ، چندر کاپورہ ، چندرانن گٹہ ، چنچل گوڑہ ، چومرچہ ، چرم کارخانہ ، چوڑ مہاراج ، چوڑی خانہ ، چوک مرغاں ، چیلہ پورہ ، چوک اسپان ، چلکل گوڑہ ، چو محلہ ، چنال بنڈہ ، چوراہا جنسی ، چھاونی نادعلی بیگ ، چھاونی مرتضی۔

ح۔ حویلی قدیم ، حسینی علم ، حسینی محلہ ، حمال واڑی ، حمید خاں مقطعہ ، حیدر گوڑہ ، حافظ بابا نگر ، حبیب نگر۔

خ۔ خرم گوڑہ ، خلاصی گوڑہ ، خیریت آباد ، خواجہ کا چلہ ، خلوت مبارک ، خواجہ صاحب درگاہ۔

د۔ داد محل ، دال منڈی ، دائی گوڑہ ، دبیرپورہ ، دریا باغ ، دودھ باولی ، دولت آباد قلعہ ، دیوڑھی دولہے خاں ، دومل گوڑہ ، دہلی دروازہ ، دھوبی گھاٹ ، دھوبن کی مسجد ، دھول پیٹ ، دھیڑواڑہ ، دیوی باغ ، دلسکھ نگر۔

ر۔ رام کوٹ ، رام سنگھ پورہ ، رام کنٹہ ، رحیم پورہ ، رنمست پورہ ، رنگزاں ، روشن دل تکیہ ، رین بازار ، رنگیلی کھڑکی ، ریاست نگر ، رامنتاپور ، رام سروپ نگر ، رام نگر ، رسالہ عبداللہ ، رسالہ خورشید جاہی۔

ز۔ زرگراں محلہ ، زنانی پھاٹک ، زنبورخانہ ، زمستاں پور ، زہرابی درگاہ۔

س۔ ساربان واڑی ، سالو بھائی ، ساہو کار پٹی ، سبحان خاں پھاٹک ، سبزی منڈی ، سدی رسالہ ، سکنڈ پلٹن ، سکھاں دیول ، سکھ واڑی ، سلیمان چاوڑی ، سنگ تولہ۔

س۔ سنگ سیاہ مسجد (بارہ گلی) سورہ واڑی (دھول پیٹ) سوماجی گوڑہ ، سونٹے پیر درگاہ ، سیتا پھل منڈی ، سیتارام پیٹ ، ستناگلی (مستعد پورہ) سید صاحب بکرے والے درگاہ ، سیف آباد ، سیف نواز

جنگ دیوڑھی (چار مینار) سید علی چبوترہ، سعید آباد، سید نگر، سکنڈ لانسر، سلطان شاہی، سرونگر، سلطان پورہ، سراج الحسن مارگ، سلیم نگر، سری نگر، سنتوش نگر، سنجیوا نگر۔

ش۔ شام بیگ مسجد (دریچہ بو علی شاہ) شاہ شبلی پہاڑی (سبزی منڈی) شاہ عالم محبوب عالم درگاہ (اکسار تھ)، شاہ عنایت گنج (بھاجی منڈی) شاہ لگن مسجد (دبیرپورہ)، شترخانہ (حویلی قدیم) شتروازی (کاروان) شجاع الدین صاحب گنبد (رین بازار)، شکر کوٹھ، شمبھو پرشاد (دریچہ بوہیر) شمشیر جنگ دیوڑھی (یاقوت پورہ) شہرور جنگ دیوڑھی (اعتبار چوک) شیخ جی حالی درگاہ (اردو شریف)، شیر گل اکمان سحر باطل)، شیوراج بہادر دیوڑھی (میدان چوک) شیورام پلی، شرنی چمن (سبزی منڈی) شاہ علی بنڈہ، شانتی نگر، شاہ حاتم نگر۔ خاں محلہ (چادر گھاٹ)

ع ۔ عبداللہ رسالہ، عثمان پورہ، عثمانیہ مسجد (دبیرپورہ) عروج محلہ (چوراہا جنسی) عسکر جنگ دیوڑھی (برہمن واڑی) عاشور خانہ شاہی (دلی دروازہ) عاشور خانہ (اردو شریف) عملہ پور، عید گاہ قدیم (رین بازار) علی آباد۔

غ ۔ غازی بنڈہ، غازی بنڈہ بیرون، غالب جنگ مقطعہ، غالب جنگ دیوڑھی، غسالاں محلہ (کٹل گوڑہ) غلام مرتضی کمنداں چھاونی، غنی یار جنگ باغ۔

ف ۔ فتح دروازہ، فرمان واڑی (ترپ بازار) فرنگی گوڑہ (جہاں نما) فلک نما، فیل خانہ، فیل خانہ چند ولال، فصیل بنڈہ، فرحت نگر، فرسٹ لانسر۔

ق۔ قاضی پورہ، قبول پاشاہ مسجد، قطبی گوڑہ۔

ک ۔ کاچی گوڑہ، کاچھی واڑی (محبوب شاہی) کاروان ساہوان، کارواں اسپان، کاشی رام (عالم علی خاں محلہ) کاغذی گوڑہ، کالوا گوڑہ (علی آباد)، کالی قبر، کالی قبور (چوراہا جنسی)، کامانی پورہ، کامانی پورہ (بازار نور خاں، سیتارام پیٹ اکبازی گوڑہ، کوتہ بستی (حیدر گوڑہ)، کتا پیٹ، کٹل منڈی، کرماگوڑہ، کرماگوڑہ (جہاں نما) کرماگوڑہ (نارائن گوڑہ)، کسار تھ، کلثوم پورہ، کامانی پورہ (جوشی واڑی) کنور جی گوڑہ (کاروان) کمرخی گنبد (سبزی منڈی) کمہار واڑی (فتح دروازہ، سیتارام پیٹ، رین بازار) کمیلہ قدیم، کیوزا بن، کنجر واڑی، کنچن باغ، کندیکل محلہ، کنگ کوٹھی، کوت محلہ (سلطان شاہی) کونر کوتوالی (کوچہ مرغ خانہ) کوکانٹی، کولسہ واڑی، کومٹ واڑی؛ کیشوگری، کلثوم پورہ، کومٹی بستی، کوٹہ گلی، کشن راؤ مارگ، کوکٹ پلی۔

گ ۔ گجی محلہ، گولی پورہ، گجی چبوترہ، گڑی کاری گوڑہ (مغلپورہ) گرومبارک (دریچہ ماتا) گلبل گوڑہ (عثمان شاہی) گلزار حوض، گنیش گھاٹ (کاروان)، گوڑی ماتا (دریچہ بھونرا)، گوشہ کٹ (چوڑی بازار) گوشہ محل، گول بنگلہ، گولہ گوڑہ (علی آباد) گولہ گلی (اکسار تھ)، گولی گوڑہ، گولی واڑہ، گھانس منڈی (چوڑی بازار، شاہ علی بنڈہ) گوبند باغ (علی آباد)۔

ل- لال دروازہ، لکڑی کا پل، للتا باغ (بھونی گوڑہ) لنگم پلی، لودھی واڑی، لوہار خانہ (بازار عنبر) لالہ گوڑہ۔

م- مادنا پیٹ، مالاکنٹہ، ماما نیک قدم مقبرہ (عیدی بازار)، ماما دل آرام مقطعہ (کٹہ تالاب میر جملہ)، ماہی پورہ (چوراہا جنسی)، متما گوڑہ، مچھلی واڑی، محبوب پورہ، محبوب چوک، مدن خاں مقطعہ (جہاں نما) مراد محل، مرزا عباس محلہ (شاہ علی بنڈہ) مرہنہ پٹی (دھول پیٹ) مستعد پورہ، مستان پورہ، مستر جان سڑک، مسلم جنگ باغ (چادر گھاٹ) مشک شاہ مسجد مشیر آباد، مصور ناکہ (گولی پورہ معظم شاہی، مغل پورہ، معین پورہ، مکہ مسجد (پنج محلہ) مکنی نعل صاحب (کاروان) مکے باولی (چنچل گوڑہ) ملائی منٹھ (کاروان) ملتانی پورہ، ملک پیٹ، ملے پلی، مہدی پٹنم، مراد نگر، معظم پورہ، مولاعلی۔

منڈوہ چنبیلی، (میدان چوک)۔ منجو میاں طویلہ (دریچہ ماتا) منگل بازار (سیتارام پیٹ) منگل ہاٹ مردھے منور (رکاب گنج) منی لال دیوڑھی، منیر جنگ باغ، موتی نالہ (دریچہ ماتا) موٹر خانہ موچی واڑہ، موسیٰ باغ (لال دروازہ) موٹر خانہ مہاراج (ناگل چنتہ) مہندی (بازار عنبر) میاکل بنڈہ، میاں پیسہ درگاہ، میدان خاں چوک، میر جملہ تالاب، میر مومن صاحب، مختار پورہ، میواتی پورہ، محبوب کی مہندی۔

ن- نارانن گوڑہ، ناصر جنگ چھلہ (کولسہ واڑی) ناکہ تاز (دھول پیٹ) ناکہ چھتری، ناگل جنتہ نالہ بازار (گھانسی بازار) ناگاباولی، نانی پورہ (علی آباد) نتھو بیگ کارخانہ، نقاش محلہ (قاضی پورہ) نجار واڑی، نرخی مقطعہ (گولی پورہ) نعلبند محلہ (محبوب شاہی) نقار خانہ، نوبت پہاڑ، نیا پل، نیولا نن (فتح میدان) نمبولی اڈہ، نلہ گنٹہ۔

و- وٹنے پلی (جہاں نما) وٹھل واڑی (نارانن گوڑہ) وکرم نبی مارگ، ودیا نگر، وجئے نگر کالونی، ونستھلی پورم۔

ھ- ہجرہ محلہ (قطبی گوڑہ) ہمت پورہ، ہمایوں نگر۔

ی- یادگار حسین کنٹہ (بارہ گلی) یاقوت پورہ، یوسف گوڑہ، یوسف صاحب شریف صاحب درگاہ یاقوت پورہ کالونی۔

حیدرآباد کے کوچے اور گلیاں

بڑے محلوں کے ساتھ کوچے بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ حیدرآباد میں بے شمار کوچے ہیں چند کی تاریخی اہمیت بھی ہے جن کے نام صدیاں گذرنے کے باوجود موجود ہیں۔

کوچہ صورت مورت۔ کوچہ صورت مورت حیدرآباد کے قدیم کوچوں میں سے ایک ہے۔ کوچہ سنار سے پرانا پل جانے والی شاہراہ پر کوکانٹی میں واقع ہے۔ یہاں سلطان عبداللہ قطب شاہ

کے خاصے کے ہاتھی جن کے نام صورت اور مورت تھے باندھے جاتے تھے۔

کوچہ چراغ علی۔ یہ پہلے اعظم یار جنگ کے نام سے موسوم تھا۔ اس کوچہ میں حیدرآباد کی پہلی لاسلکی نشرگاہ قائم ہوئی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کے لئے کوچہ چراغ علی سے متصل عمارتیں حاصل کی گئی تھیں۔ مولوی چراغ علی کا خطاب اعظم یار جنگ تھا۔

کوچہ مقرب جنگ۔ مقرب جنگ امراء سلطنت سے تھے۔ چراغ علی لین سے متصل یہ کوچہ واقع ہے۔

کوچہ فتح سلطان۔ فتح سلطان کا پائیگاہ سے تعلق تھا۔ ان سے یہ کوچہ موسوم ہے۔

کوچہ قادر نواز جنگ۔ قادر نواز جنگ ممتاز امراء سے تھے۔ ان کے نام پر یہ کوچہ ہے۔

بارہ گلی۔ حسینی علم کے قریب بارہ گلیوں والا خطہ ہے۔

گولہ گلی۔ اس گلی کا نام ایک بڑے گولے Cannon کی وجہ سے مشہور ہوا۔

کڑوے صاحب کی گلی۔ پرانی حویلی کے نزدیک یہ گلی واقع ہے۔

کونھا گلی۔ گلزار حوض کے قریب یہ گلی دو سو سال سے مشہور ہے۔

موتی گلی۔ لاڈ بازار کے جنوبی سمت موتی گلی ہے۔ یہاں سے خلوت کو راستہ جاتا ہے۔ قطب شاہی عہد میں یہاں موتیوں کا کاروبار ہوا کرتا تھا۔

ایرانی گلی۔ حیدرآباد میں ایرانی الاصل باشندگان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ گولکنڈہ کے سلاطین بھی ایران سے آئے تھے۔ ایرانی امراء کی دربار میں بڑی قدر تھی۔ ایرانی ہر دور میں حیدرآباد کی تہذیبی زندگی کا اہم حصہ رہے ہیں۔ چارمینار سے آگے ایک پورا محلہ ایرانیوں سے آباد تھا۔ آج بھی اس علاقہ میں ایک گلی ایرانی گلی کہلاتی ہے۔

حیدرآباد کے کوچے

(گلیاں، اسٹریٹ، واڑی، لائن وغیرہ)

اپر بستی (کاچی گوڑہ) انبہ گھراں (بازار نور خاں) اچھے میاں (چنچل گوڑہ) احمد علی بیگ (فتح دروازہ) اسٹیشن بازار (توپ خانہ) اصلاح سازاں (چھتہ بازار) اعجاز حسین (دارالشفاء) الماس (چادر گھاٹ) برہمن واڑی) امام جنگ (دودھ باولی) املی بن (قطبی گوڑہ) اندی سری نواس راؤ (ہری باولی) اندھیری گلی (کاروان) انوار اللہ (حبیب نگر) اوپر گوڑہ (چھاونی ناد علی بیگ) ایرانی گلی، ایلچی پورہ (دبیر پورہ) اڈیکمیٹ

باکوارم، بالاجی کندان (دبیر پورہ) بالشٹی کھیت۔ بالمکند (ہری باولی) ببر علی (کنل گوڑہ) برہمن واڑی (کنل منڈی، ہری باولی) بڑا بندہ (پل قدیم) بڑی بانی (دبیر پورہ) بسنا تھ (برہمن واڑی)

بسید پورہ (کاچی گوڑہ) بشیرالدین (ملک پیٹ) بلونت راؤ (لال دروازہ) بنسی راجہ قہوہ خانہ (بارہ گلی) بنسی راجہ اسنور (بارہ گلی) بن شامس جمعدار (میدان چوک) بنگی گلی (یاقوت پورہ) بورابنڈہ (لال دروازہ) بوریہ فروش (چوراہا جنسی) بوریہ واڑی (چوڑی بازار) بونگی ٹی (دودھ باولی) بولی پورہ، بہادر خاں ڈھونگی (دودھ باولی) بہار مل (عجیب چوک) بھالداروازی (دلی دروازہ) بھانجی واڑی (کاروان) بہروپیہ (بارہ گلی) بہرے سائیں (دبیرپورہ) بہشتیاں (بازار نورخاں) بہشتی واڑہ (سلطان شاہی) بہشتی واڑی (خیریت آباد) بیرین، بھوانی پورہ، بھولک پور، بھومیا حکیم (یاقوت پورہ) بیانڈلانن (فتح میدان) بینی صاحب۔

پ۔ پاپامل چی مل (شاہ گنج) پان والے (دودھ باولی) پتلی (سلطان شاہی) پتلی والی (چارکمان) پتھروٹی، پٹھانان (کاچی گوڑہ) پٹیل (ملک پیٹ) پرتاب باغ (توپ خانہ) پری محل (یاقوت پورہ) پلما (قاضی پورہ) پنجہ گلی (شاہ گنج) پداگوڑہ (لال دروازہ) پنج بنگلی ہنوماں (علی آباد) پوچما گلی (بارہ گلی) پوچمادیول (ہری باولی) پید ما (لال دروازہ) پیرپاشاہ (دبیرپورہ) پہاڑی شریف، پیرپاشاہ درگاہ (شاہ گنج) پیشکار (شاہ گنج)

ت۔ تاراچند (لال دروازہ) تاراصاحب (سلطان پورہ) توپ خانہ، توپ خانہ (گھانسی بازار) تولہ صاحب (یاقوت پورہ) توپ خانہ آسمان جاہی (بارہ گلی) تیلی گلی (چارکمان) تیلن، تلجاگوڑہ، تیغہ۔

ٹ۔ ٹپہ خانہ (ناگل چنتہ) ٹکسال (کمان سحرباطل) ٹلکیری پٹی (ڈھول پیٹ) ٹیپوصاحب (بازارنورخاں ٹولی چوکی۔

ج۔ جلال کوچہ، جام باغ (ترپ بازار، سلطان پورہ) جاں فنگلاس (سلطان شاہی) جانی میاں (بارہ گلی جما بانی (لال دروازہ) جمالہ بستی (کاچی گوڑہ) جمعدار گلی (سبزی منڈی) جمعہ گلی (شاہ گنج) جنانارانن (چنکنی پورہ) جنید یار جنگ (کالاڈیرہ) جوگن (کمیلہ) جوہری گلی، جھنڈا گلی (تیغہ) جھنڈا گلی (اگرونا)۔

چ۔ چاپل روڈ، چارنعل (فتح دروازہ) چاند پٹیل (مغل پورہ) چراغ علی (فتح میدان، دودھ باولی) چماران (تیغہ) چنتل گوڑہ، چنتل بستی (خیریت آباد) چنیازرگر (دبیرپورہ) چوڑی والی (اعتبار چوک)

ح۔ حبیب علی شاہ درگاہ (کنگل منڈی) حجام (دارالشفاء) حسن صالح (مغل پورہ) حبشی گوڑہ حسینی علم، حفیظ اللہ شاہ (مغل پورہ) حکمت جنگ (دارالشفاء) حمال واڑی (سلطان شاہی) حسن نگر۔

خ۔ خاکروباں (تیغہ) خواجہ معین الدین (حسینی علم) خیاطاں (دودھ باولی) خیاطاں (فتح دروازہ)۔

د۔ دادن صاحب (تلجاگوڑہ) دادامیاں (معظم جاہی مارکٹ) داراب جنگ (یاقوت پورہ) دریچہ بوا ہیہ دارالشفاء، داور علی خاں (خیریت آباد) دانی گوڑہ (کاروان) درخت لال املی (بازار عنبر) دودھ خانہ (سلطان شاہی) دھنگر واڑہ (خیریت آباد) دھوبی گلی (ملک پیٹ) دھیرواڑہ (حبیب نگر، بازار عنبر، چارمینار، خیریت آباد، دریچہ ماتما) دیگچی گلی (صمصام الملک بازار) دیمال شاہ درگاہ (برہمن واڑی)

دینا ناتھ (شاہ علی بنڈہ)۔

ڈ۔ ڈیرہ (کاچی گوڑہ)

ر۔ راجیشورراؤ (حسینی علم) رام چندرراؤ دیول (گولی پورہ) رامکا (دبیرپورہ) رام لال (کولہ واڑی) راور نبھا (بازارنورخاں) رانے رایاں (ڈھول پیٹ) رتھ خانہ (چیلہ پورہ) رفعت الملک (میدان چوک) رنگاریڈی (ملک پیٹ) رنگ راؤ (بیلہ) رنگ علی شاہ دریچہ (یاقوت پورہ گچی باولی) رنگنا کلال (بارہ گلی) روشن علی (بارہ گلی) ریٹھا گلی (حسینی علم)

ز۔ زچاباِئی (چنچل گوڑہ) زردعلی شاہ (اردو شریف) زرگراں (رکاب گنج) زرگراں (چادرگھاٹ) زنانی پھاٹک (دریچہ ماتا) زورآور جنگ (مغلپورہ)

س۔ ساروں بھاں (حیدرگوڑہ) سدی عنبر (حسینی محلہ) سردار یار جنگ (ایرانی گلی) سردار بیگ (چیلہ پورہ) سرور جنگ (چنچل گوڑہ) سعادت اللہ خاں (تلجاگوڑہ) سلطان گلی (سلطان پورہ) سکندر خاں (بارہ گلی) سکھ واڑی (محبوب پورہ) سید صاحب (دبیرپورہ) سید صاحب درگاہ (حسینی محلہ) سید فاضل (چادرگھاٹ)۔

ش۔ شاہ پور (مقطعہ شاہ پور) شادی لال (گچی چبوترہ) شاماگھڑیالن (کمان سربا طل) شاہ خاموش (نامپلی) شاہ روپ مستان (مغل پورہ) شکارخانہ (گچی چبوترہ) شعبانی گلی (جیاگوڑہ) شنکر باغ (تلجاگوڑہ) شیخ حیدر (چھتہ بازار) شیر علی (بارہ گلی) شیشیا (کاچی گوڑہ) شیطان (تیغہ) شکر خانہ۔

ص۔ صدرامین (بازارنورخاں، الاوہ یتیماں) صرافان (چادرگھاٹ) گاڑی خانہ (ترپ بازار) صمصام الدولہ (چنچل گوڑہ) صنم (شاہ گنج) صورت مورت۔

ط۔ طالب الدولہ (شاہ گنج) طوطارام (علی آباد)۔

ظ۔ ظفرالدولہ (دودھ باولی) ظہیرالدین خاں (سلطان پورہ)

ع۔ عابد نواز جنگ (خیریت آباد) عاشورخانہ شاہی، عبدالباقر خاں (حسینی علم) عبدالغنی شاہ (خیریت آباد) عبدالرزاق (ترپ بازار) عبدالقادر (بارہ گلی) عبدالقیوم (تلجاگوڑہ) عروب (دریچہ ماتا) عزت یار جنگ (مغل پورہ) عالم علی خاں، عمر خاں (بارہ گلی)

غ۔ غلامان (چنچل گوڑہ) غلام محمد (فتح دروازہ) غلام نبی (لال دروازہ) غوث پورہ (نامپلی)۔

ف۔ فتح اللہ بیگ (چارمینار) فتح سلطان (کٹل منڈی) فرخ مرزا (حسینی علم) فراش خانہ (چھتہ بازار، منڈوہ چنبیلی) فردیدوں جاہ (شاہ گنج) فصیح جنگ (تلجاگوڑہ) فقیرواڑہ (لنگم پلی) فقیروں کی گلی (ملک پیٹ)۔

ق۔ قادرگوڑہ (نامپلی) قادرنواز جنگ (کٹل منڈی) قاسم اسفور (بارہ گلی) قصابان گاؤ (تیغہ) قصاباں (کولسہ واڑی) قطب صاحب (بازار چھتہ) قمرالدین (بارہ گلی)

ک- کالے صاحب (ہری باولی) کالی مسجد (تیغہ) کبوتر خانہ قدیم، کبوتر خانہ جدید (کمان سر باطل) کپتان (کاچی گوڑہ) کتب خانہ آصفیہ (ترپ بازار) کتا گلی (چارکمان) کوتہ گلی (ڈھول پیٹ) کڑوے صاحب (دبیرپورہ) کلب علی (شاہ گنج) کوٹہ قدیم (بھاجی منڈی) کلی میاں (شکر گنج) کمبل پوش (گچی چبوترہ) کملی والے شاہ (دبیرپورہ) کندان (چار محل) کمباران (منک پینٹھ) کمباروازی (فتح دروازہ) کمبار کنواں (کالاڈیرہ) کنڈی کشن راؤ (کیلہ قدیم) کندن گر تھمیا (بیلہ) کمباراں (چادر گھاٹ) کھوکر واڑی، کرنول والے شاہ صاحب (کوکانٹی)

گ- گلزراں (کسارٹھ) گانجہ گلی (میدان خاں) گچی چبوترہ، گلاب سنگھ (کوکانٹی) گندم رامنا کلال (کنٹل گوڑہ) گندہ گلی (جیا گوڑہ) گنڈے مرزا (فتح دروازہ) گنیش راؤ (فیل خانہ) گولی واڑہ (کولسہ واڑی، خیریت آباد)۔

ل- لال پرشاد (سلطان شاہی) لال گراں (افضل گنج) لالہ میاں (دبیرپورہ) لطیف پورہ (کنٹل منڈی)۔

م- ماما جمیلہ (منڈوہ چنبیلی) ماما رمضانی (چھاونی نادعلی بیگ) مجلس رانے (حسینی علم) محبوب علی (بارہ گلی) محمد حسین خاں (حویلی قدیم) محمد شاہ میاں (صمصام الملک بازار) محمد میاں (فتح دروازہ) مخدوم علی (بیرون گولی پورہ) مدک خانہ (بازار صمصام الملک) مرثیہ خواں (دارالشفاء) مرزا علی (حویلی قدیم) مظفر جنگ (مغل پورہ) معز پاشاہ (موتی گلی) معماراں (چنچل گوڑہ) مفتی صاحب (ہری باولی) مقدم جنگ (شکر گنج) مکہ شاہ درگاہ (لنگم پلی) مکھن لال (کاروان) مکھن لال (ہری باولی) مکے میاں (شکر گنج) معز یار جنگ (خیریت آباد) ملا مراد علی (تیغہ) منڈلی گنبد (بارہ گلی) منڈوہ گنبد جدید (بارہ گلی منڈوہ چنبیلی (میدان خاں چوک) موتی گلی، مومن صاحب (بارہ گلی) مہاراج گنج (دودھ باولی) مہتاب خاں جمعدار (چنچل گوڑہ) میدان (ہری باولی) میر شکاری (تیغہ) میر محلہ (فتح دروازہ) میر معانی خاں (بارہ گلی) میر مغاں (شاہ گنج) میر مومن (علی آباد) مسیما (کیلہ قدیم) منیار بنی (قطبی گوڑہ) میلار گوڑہ (چنچل گوڑہ) مالا کنٹہ، ملے پلی۔

ن- نارائن یشونت راؤ (لال دروازہ) ناگوراؤ (بیلہ) نانا کامانی (لال دروازہ) نانا میاں (کالاڈیرہ) نثار حسین (بارہ گلی) نجاران (کنٹل گوڑہ) نجاران (چادر گھاٹ) نرسنگ بھان دیول (حسینی علم) نسیم (کوچہ نسیم) ناغو جمعدار (برہمن واڑہ) نقار چیاں (دریچہ ماتا) نقاشاں (محبوب پورہ) نکھی گوٹہ (بارہ گلی) نواب میاں (شکر گنج) نوگرہ (شاہ علی بنڈہ) نہر (نور خاں بازار) نام پلی۔

و وزیر علی بخشی (چھتہ بازار) وزیر علی مرثیہ خواں (دارالشفاء)۔

ھ ہربنس سنگھ (مغل پورہ) ہنومان (شاہ علی بنڈہ) ہنومان گلی (کاروان) ہنومان (بارہ گلی) ہنومان دیول (سکنڈ پلٹن) ہیرالال (خزانہ جل پلی) ہیرا بائی گڈہ (دریچہ ماتا) ہوزنون (نیمو صاحب مقطعہ)۔

ی: یسین (الاوہ یتیماں) یلما (قاضی پورہ)۔

حیدرآباد کے کوٹلے

کوٹ بمعنی قلعہ یعنی محصور اور فصیل بند علاقہ۔ امراء اپنے رہائشی مکانات بالعموم محصور بنایا کرتے ہیں۔ اس وجہ سے بعض مخصوص دیوڑھیاں کوٹلہ کہلاتی ہیں۔

کوٹلہ عالیجاہ

آصف جاہ ثانی کے ایک فرزند کا نام عالی جاہ تھا جنہوں نے اپنی دیوڑھی کو قلعہ کے انداز سے بنایا تھا۔ اس لئے اس کو کوٹلہ کہا جانے لگا۔ آج تک اس علاقہ کا نام کوٹلہ عالی جاہ ہے۔

چند مشہور کوٹلے

اکبر جاہ کا کوٹلہ، کیوان جاہ کا کوٹلہ، ساور نبے کا کوٹلہ، احسن اللہ خاں کا کوٹلہ اور چھوٹا کوٹلہ مغل پورہ۔

حیدرآباد کے گھنٹہ گھر

حیدرآباد میں کئی گھڑیالیں اور گھنٹہ گھر ہیں جہاں وقت بتانے کا سرکاری طور پر انتظام ہوتا ہے قدیم زمانہ میں دھوپ گھڑیاں تھیں۔ مکہ مسجد کے صحن میں ایسی ایک دھوپ گھڑی موجود ہے۔ سکندرآباد اور سلطان بازار کے گھنٹہ گھر انگریزوں کے بنائے ہوئے تھے۔ چند مشہور گھنٹہ گھر یہ ہیں

چوک کی گھڑی، چار مینار کی گھڑیالیں، خلوت مبارک کی گھڑی، معظم جاہی مارکٹ کی گھڑیالیں، نام پلی اسٹیشن، سکندرآباد اسٹیشن اور کاچی گوڑہ اسٹیشن کی گھڑیالیں، سکندرآباد کلاک ٹاور، سلطان بازار کلاک ٹاور، میر عالم منڈی کی گھڑیال، سرور جنگ کی گھڑیاں، مہاراجہ کی دیوڑھی کی گھڑیال اور شاہ علی بنڈہ کا گھنٹہ گھر وغیرہ۔

حیدرآباد کے سرائے

سرا یا سرائے کے معنی گھر، حویلی، قیام گاہ، ٹھہرنے کی جگہ، مسافر خانہ اور دھرم شالہ ہیں۔ دنیا کے متمدن شہروں کی طرح حیدرآباد میں ہر دور میں کثرت سے سرائے تعمیر ہوتی رہیں۔ یہ سرائیں مساجد، منادر اور عام شاہراہوں پر تعمیر کی جاتی تھیں۔ بعض تاریخی مساجد میں آج بھی ان قدیم سرائے کے آثار باقی ہیں۔ منادر اور شاہراہوں پر بھی پرانی سرائے کی باقیات ملتی ہیں۔ سرائے تعمیر کرنا کار ثواب تصور کیا جاتا ہے۔ سلاطین اور امراء بطور خاص سرائے تعمیر کرواتے تھے حیدرآباد کی مشہور سرائیں یہ تھیں۔

سرائے دارالشفاء، سرائے میاں مشک، سرائے افضل المساجد، سرائے جواہر، کاروان

سرائے، صلح سرائے، دکن کی سرائے، سرائے حیات نگر وغیرہ۔

حیدرآباد کے احاطے

احاطہ کے معنی حلقہ، گھیرا، چہار دیواری کے نکلتے ہیں۔ حیدرآباد کے اکثر احاطے رہائشی کامپلکس کی حصار بندی کے لئے تھے۔ چند مشہور احاطے یہ تھے۔

احاطہ اکبر صاحب، احاطہ امراللہ شاہ، احاطہ بہرام الدولہ، احاطہ عرضی بیگ، احاطہ فخرالملک، احاطہ میر پاشاہ، احاطہ شرفی چمن، احاطہ ڈاکٹر وزیر علی، احاطہ چنور پیراں، احاطہ موسی قادری، احاطہ روشن الدولہ، احاطہ احمد مرزا، احاطہ کرار جنگ، احاطہ جواہراں، احاطہ جہاندار جاہ، احاطہ علی یاور الدولہ وغیرہ۔

حیدرآباد کی تعلیمیں

حیدرآباد والوں کو کسرت، جسمانی ورزش اور پہلوانی کا شوق زمانہ قدیم سے ہے۔ ہر محلہ میں ورزش گاہیں موجود تھیں جنہیں تعلیم کہا جاتا ہے۔ چند مشہور تعلیمیں یہ ہیں۔ تعلیم شرزہ، تعلیم لال، تعلیم دبیر پورہ، تعلیم عملہ پور، تعلیم ملز، تعلیم جنگلی، تعلیم نجیا، تعلیم پہنچ بھیا، تعلیم عبدالصمد، تعلیم عیسی پہلوان، تعلیم علی پہلوان، تعلیم بیگم بازار، تعلیم عبدالجبار، تعلیم گرا سنگھ، تعلیم سلطان، تعلیم سدی، تعلیم انور خاں، تعلیم خواجہ خان، تعلیم بنوٹ۔ ان کے علاوہ سینکڑوں اکھاڑے موجود تھے۔ جہاں فن کشتی کی مشق کی جاتی تھی۔

حیدرآباد کے حمام

حمام۔ کا رواج بیرون ہند میں زیادہ ہے۔ مسلمان اپنے ساتھ اس طریقے کو لائے قطب شاہی دور میں سرائے اور حمام خاص اہتمام سے بنائے جاتے تھے۔ حیدرآباد میں دو مشہور حمام تھے۔ دارالشفاء کا حمام اور میاں مشک کا حمام۔

سوئمنگ پول

عہد جدید میں سوئمنگ پول کا رواج عام ہے۔ حیدرآباد میں بے شمار سوئمنگ پول ہیں جہاں پیراکی کی تربیت کا خاص انتظام ہے۔ ہر بڑے کلب، ہوٹل اور ہاسٹل میں عصری سوئمنگ پول موجود ہیں۔

...

حیدرآباد کے ریلوے اسٹیشن

ریاست حیدرآباد میں ریلوے کا آغاز 1866ء میں ہوچکا تھا۔ جب کہ بمبئی سے براہ رائچور مدراس کے لئے ریلوے لائن بچھائی گئی۔ اس کے تین سال بعد ایچ ای ایچ دی نظامس اسٹیٹ ریلوے کے نام سے حیدرآباد کی ریلوے لائن کا کام شروع ہوا۔ 17/ جولائی 1874ء سے سکندرآباد تا وتارآباد ریل گاڑی کی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوا۔

سکندرآباد ریلوے اسٹیشن

سکندرآباد نہ صرف یہ کہ مملکت آصفیہ کا اہم ریلوے اسٹیشن تھا بلکہ پورے جنوبی ہند میں اس کی حیثیت مرکزی جنکشن کی سی تھی۔ مدراس، کلکتہ، دہلی، بمبئی کے درمیان اس کی نوعیت رابطہ کی کڑی کی طرح تھی۔ ماضی میں یہاں سے نظام گیارنٹیڈ اسٹیٹ ریلوے۔ جی آئی پی، مدراس ریلوے گوداوری دہلی ریلوے اور سدرن مرہٹہ ریلوے کی ریل گاڑی گذرتی تھیں۔

سکندرآباد ریلوے اسٹیشن بحیثیت جنکشن ابتداء ہی سے مسافرین کی آمد ورفت اور مال کی درآمد وبرآمد کا اہم مرکز رہا ہے۔ یہاں سے پورے ہندوستان کو مال بھیجا اور لایا جاتا ہے۔ یہ اسٹیشن اپنی وسعت کے لحاظ سے ہندوستان کے چند گنے چنے جنکشنوں میں شمار ہوتا ہے۔

براڈگیج اور میٹرگیج دونوں طرح کی لائنس سکندرآباد میں موجود ہیں۔ گویا اس کا رابطہ ملک کے حصہ سے یکساں طور پر جڑا ہوا ہے۔ یہاں کئی پلیٹ فارم ہیں۔ بیک وقت آٹھ ریل گاڑیوں کے ٹہرنے کے پلیٹ فارم موجود ہیں۔ سکندرآباد ریلوے اسٹیشن سے کم از کم 20 اہم اکسپریس گاڑیاں نکلتی ہیں۔ ان کے علاوہ سست رفتار اور مال گاڑیوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ سکندرآباد سے ملک کے مختلف اہم شہروں کو جانے والی گاڑیوں کے نام یہ ہیں۔

آندھراپردیش اکسپریس (سکندرآباد - نئی دہلی)، کرشنا اکسپریس (سکندرآباد - تروپتی)، کونارک

اکسپریس (سکندرآباد - بھوبنیشور) گولکنڈہ اکسپریس (سکندرآباد - گنٹور)، مدراس اکسپریس، مینارا اکسپریس (سکندرآباد - بمبئی)، ورنگل فاسٹ پاسنجر، چارمینار اکسپریس (سکندرآباد - مدراس)، گوداوری اکسپریس (وشاکھاپٹنم)، گوتمی اکسپریس (کاکی ناڈا) نرساپور اکسپریس، نظام آباد اکسپریس، پرلی وبجناتھ، ندی کوڈو فاسٹ پاسنجر، سرپور کاغذ نگر، گورکھپور اکسپریس، سوڑہ ایسٹ کوسٹ اکسپریس، راج کوٹ ویکلی اکسپریس، کوچین بانی ویکلی اکسپریس۔ یہ ساری گاڑیاں براڈ گیج پر چلتی ہیں۔

میٹر گیج کی گاڑیوں میں وینکٹادری اکسپریس، منماڑ اجنتا اکسپریس، اجمیر اکسپریس، کرنول ٹاون تنگبھدرا اکسپریس، گنتکل اکسپریس، منماڑ پاسنجر، نظام آباد پاسنجر، اجمیر فاسٹ پاسنجر، منماڑ فاسٹ پاسنجر اور پورنا اکسپریس شامل ہیں۔

ناملی ریلوے اسٹیشن

ناملی موضع میں حیدرآباد کا سب سے اہم اور قدیم ریلوے اسٹیشن 1874ء میں تعمیر کیا گیا۔ اس اسٹیشن کو عام طور پر ناملی اسٹیشن کہا جاتا ہے جب کہ ریلوے والے اسے حیدرآباد اسٹیشن کہتے ہیں۔ یہ نواب میر محبوب علی خاں کے عہد میں بنایا گیا تھا۔ خود انہوں نے اس اسٹیشن سے دو تین اہم سفر کئے اور یہاں پر وائسرائے ہند کا خیر مقدم بھی کیا۔

ناملی اسٹیشن کی کئی مرتبہ توسیع و ترمیم ہوئی۔ اس کے طرز تعمیر میں ہندو مسلم آرکیٹکچر کا بطور خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ اسٹیشن ہر دور میں بے حد مصروف رہا ہے۔ یہاں سے مسافروں کی آمد و رفت کے ساتھ ساتھ مال کی حمل و نقل بھی ہوتی ہے۔ چند برس قبل ناملی اسٹیشن کی وسیع پیمانے پر تعمیر و مرمت ہوئی ہے۔ ریلوے پٹریوں کے اوپر دوسرے پلیٹ فارموں پر جانے کے لئے اوور برج بنائے گئے ہیں۔ اس وقت یہاں چھ پلیٹ فارم ہیں جو دن رات مصروف رہتے ہیں۔ نام پلی سے صرف براڈ گیج کے مسافرین ہی سفر کر سکتے ہیں۔ 24 گھنٹوں میں حسب ذیل ریلیں یہاں سے کوچ کرتی ہیں۔

مدراس اکسپریس، ورنگل فاسٹ پاسنجر، تروپتی رائلسیما اکسپریس، مدراس چارمینار اکسپریس، وشاکھاپٹنم گوداوری اکسپریس، گورکھپور اکسپریس، نرساپور اکسپریس، حضرت نظام الدین اکسپریس، بمبئی اکسپریس، پرلی وبجناتھ، پونا پاسنجر، بنگلور سٹی، سوڑہ ایسٹ کوسٹ، کوچین بانی ویکلی اکسپریس۔

کاچی گوڑہ اسٹیشن

کاچیوں یعنی مچھیروں کی بستی میں 1928ء میں میٹر گیج کا ایک اہم اسٹیشن تعمیر کیا گیا جو کاچی گوڑہ اسٹیشن کہلاتا ہے۔ اس اسٹیشن کی وجہ سے مسافرین اور تاجروں کو بے حد آرام ملا۔ یہاں سے مسافر گاڑیاں اور مال گاڑیاں دونوں نکلتی ہیں۔ چند اہم ریلیں حسب ذیل ہیں۔

وینکٹ دری اکسپریس، منماڑ اجنتا اکسپریس، اجمیر اکسپریس، تنگبھدرا اکسپریس، گنتکل

URDU HALL ...
HYDERABAD-500020

اکسپریس، ذورناچلم پاسنجر، محبوب نگر پاسنجر، کاچی گوڑہ کرنول ٹاون پاسنجر، اجمیر فاسٹ پاسنجر، منماڑ فاسٹ پاسنجر۔

دیگر ریلوے اسٹیشن

خیریت آباد، جیمس اسٹریٹ، بیگم پیٹ، لنگم پلی، صنعت نگر، مولی علی، بالانگر، فلک نما، اپوگوڑہ، دبیرپورہ، ملک پیٹ، یاقوت پورہ، برکت پورہ، جامعہ عثمانیہ، شمس آباد، حفیظ پیٹ، عمدہ نگر، اپل وغیرہ۔

رصد گاہ نظامیہ

بیگم پیٹ میں رصد گاہ نظامیہ قائم کی گئی تھی۔ اس میں طاقتور دوربینیں رکھی گئی تھیں۔ انتظامات کے لئے دفتر نظامت قائم کیا گیا تھا۔

حیدرآباد کے میوزیم

عجائب گھروں کا سلسلہ اگرچہ زیادہ قدیم نہیں ہے لیکن جتنے میوزیم ہیں وہ اپنے ذخائر کے سبب بے مثال ہیں۔ چند نام یہ ہیں۔ گولکنڈہ میوزیم، آثار قدیمہ میوزیم، ہلت میوزیم اور ایوان اردو میوزیم۔

سالار جنگ میوزیم

صرف ایک فرد کے ذوق کا کمال حیدرآباد کا سالار جنگ میوزیم ہے جو پوری دنیا میں واحد مثال ہے۔ نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ نے زندگی بھر نوادرات اکٹھا کر کے ایک ایسا ذخیرہ چھوڑا ہے جو آنکھ کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔

سالار جنگ میوزیم رود موسی کے مشرقی کنارے پر دیوان دیوڑھی سے متصل واقع ہے۔ 1951ء میں اس میوزیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے افتتاح کیا۔ 1968ء میں نئی تعمیر کردہ عمارت میں میوزیم منتقل کیا گیا۔ میوزالوجی کے اصولوں کے مطابق نوادرات کو سجایا گیا ہے۔ بیرونی سیاحوں کے لئے یہ میوزیم بے حد پر کشش ہے۔ میوزیم سے ملحقہ ایک عظیم الشان لائبریری بھی ہے جہاں نایاب مخطوطات کا بہترین ذخیرہ ہے۔

حیدرآباد میں مجسمے

مجسموں کی تنصیب کا ماضی میں کوئی رواج نہ تھا۔ آزادی کے بعد سے مہاتما گاندھی کے مجسمے نصب کئے جانے شروع ہوئے۔ علاوہ ازیں تمام اہم قومی قائدین کے مجسمے شہر کے اہم مقامات پر نصب ہیں۔ حسین ساگر پر بھی حال ہی میں کئی مجسمے نصب کئے گئے ہیں۔ راک جبرالٹر پر

گوتم بدھ کا مجسمہ نصب کیا گیا ہے۔

حیدرآباد کی صنعتیں

حیدرآباد میں صنعت و حرفت کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ اس شہر کی تاریخ ہے۔ یہاں پر دستکاری، صناعی، مصوری کے ساتھ ساتھ چھوٹے، اوسط اور بڑے پیمانے کی صنعتوں کا ہر دور میں چرچا رہا ہے۔ حیدرآباد کا شمار بہترین صنعتی شہروں میں ہوتا ہے۔

حیدرآباد میں بندوق سازی کا پہلا کارخانہ 1873ء میں قائم ہوا۔ یہ کارخانہ بارہ گلی میں محمد قاسم نے کھولا تھا۔ محمد قاسم نے یوروپ سے مشنری منگوائی تھی۔

توپ سازی کا کارخانہ 1876ء میں بالاپور میں کھولا گیا تھا۔ نارائن گوڑہ میں صدر انبار خانہ قائم کیا گیا تھا۔ دارالصناع سے موسوم ایک کارخانہ جہاں توپیں بنائی جاتی تھیں قاضی پورہ میں مولوی محمود نے قائم کیا تھا۔

حیدرآباد میں پارچہ بافی، کاغذ سازی، شال بافی اور شکر سازی کے کارخانے قائم کئے گئے تھے۔ یہ کارخانے علی الترتیب بالاپور، گولکنڈہ اور نارائن گوڑہ میں تھے۔

حیدرآباد میں بڑے پیمانے کی صنعتیں مختلف النوع تھیں جن میں خاص حیدرآباد میں پارچہ بافی کے بڑے ملز رام گوپال ملز لمیٹڈ حیدرآباد، حیدآباد اسپننگ اینڈ ویونگ ملز حیدرآباد۔ دیگر صنعتوں میں وزیر سلطان تمباکو کمپنی، حیدرآباد دکن سگریٹ فیکٹری، دکن گلاس ورکس، تاج گلاس فیکٹری شامل تھے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں کو بھی یہاں بہت فروغ ہوا۔

چوڑیوں کی صنعت اور بیدری صنعت اپنا خاص مقام رکھتی ہیں۔ دیگر مشہور کارخانوں میں کارخانہ انیس الغرباء، کارخانہ زندہ طلسمات، انفن نون اور روز بسکٹ، حیدرآباد اسٹارچ پراڈکٹس، حیدرآباد لیدر گڈز فیکٹری، ایس پی آئیل کلاتھ اینڈ الائیڈ پراڈکٹس، سالار جنگ شوگر ملز، حیدرآباد انامل ورکس، حیدرآباد پورسلین اینڈ چیناویر لمیٹڈ، سرجیکل اینڈ ڈریسنگ ورکس، تاج برکس لمیٹڈ، سگنل اسپورٹس لمیٹڈ، حیدرآباد واٹر پراڈکٹس لمیٹڈ، پنالال جی فیبرکس لمیٹڈ، حیدرآباد کیزیز لمیٹڈ، حیدرآباد نیشنل انڈسٹریز لمیٹڈ، اسمال اسکیل انڈسٹریز، نیشنل فوڈ پراڈکٹس، حیدرآباد پلاسٹک لمیٹڈ، حیدرآباد پرفیومری اینڈ کاسمیٹکس، حیدرآباد رولر فلور ملز لمیٹڈ، ڈیبونائر، حیدآباد ڈیجٹل اینڈ آئیل پراڈکٹس، محبوبیہ کارخانہ جلد سازی، غوثیہ بٹن فیکٹری، کارخانہ محمد صدیق اور کارخانہ نزاکت آملہ ہیر آئیل وغیرہ۔

دواخانے

حیدرآباد کا پہلا دواخانہ "دارالشفاء" ہے جسے سلطان محمد قلی قطب شاہ نے 1595ء میں تعمیر

کروایا تھا۔ دارالشفاء کی عمارت حیدرآباد کی قدیم ترین کہی جاسکتی ہے اس کا دروازہ بے حد بلند تھا۔ اندر ایک مربع صحن تھا جس کے چار طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ کمرے دو منزلہ تھے۔ ان میں معالج اور مریض دونوں کی رہائش کا انتظام تھا۔ علاج کے لئے شاہی خزانے سے رقومات خرچ کی جاتی تھیں۔ مریضوں کے قیام و طعام کا مفت انتظام تھا۔ حکومت کی طرف سے اطباء کو تنخواہیں دی جاتی تھیں۔

عہد آصف جاہی میں بھی دیسی طریقہ علاج اور یونانی طب کے کئی دواخانے کام کرتے تھے۔ نواب افضل الدولہ بہادر نے حیدرآباد میں ایک بڑا شفاخانہ قائم کیا تھا جسے دواخانہ افضل گنج کہا جاتا تھا۔ اسی دواخانے کے احاطہ میں پہلا میڈیکل کالج بھی قائم کیا گیا تھا۔ آصف جاہ سابع کے دور حکومت میں یہی شفاخانہ افضل گنج - عثمانیہ جنرل ہاسپٹل - میں تبدیل ہوگیا۔ اسی عہد میں وکٹوریہ زنانہ ہاسپٹل، کنگ ایڈورڈ میموریل ہاسپٹل، سلطان بازار ہاسپٹل اور فیور ہاسپٹل قائم ہوئے۔

حیدرآباد میں طب یونانی نے سلاطین آصفیہ کی دلچسپی اور سرپرستی کی بناء پر بے حد ترقی پائی۔ ایلوپیتھی طریقہ سے قبل عوام و خواص یونانی علاج ہی کرواتے تھے۔ یہاں پر ایک سے قابل ایک طبیب موجود تھے جن کے خانگی مطب میں صبح و شام مریضوں کا اژدہام رہتا تھا۔ سرکاری زیر انتظام یونانی دواخانے بھی موجود تھے۔ عہد آصف جاہ سابع میں نظامیہ صدر شفاخانے کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی۔

شہریوں کی طبی ضروریات کی تکمیل جس سے تمام لوگوں کو راحت ملے اور مالی طور پر پچھڑے ہوئے طبقات اور غریبوں کو بطور خاص فائدہ پہنچانے کے لئے حیدرآباد کی ہر حکومت نے اس جانب بطور خاص توجہ دی۔

حیدرآباد میں اس وقت سرکاری سطح پر کام کرنے والے دواخانوں کی جملہ تعداد 25 ہے جن کے منجملہ 22 ایلوپیتھی طریقہ علاج کے اور ایک ایک دواخانہ یونانی، ایورویدک اور ہومیوپیتھی طریقہ علاج کا ہے۔ ان کے علاوہ ایلوپیتھی کی 27 ڈسپنسریاں، 2 آیورویدک اور ایک یونانی ڈسپنسری موجود ہے۔

شہر میں ان دواخانوں اور ڈسپنسریوں کے ساتھ ساتھ 77 نرسنگ ہوم ہیں جہاں مریضوں کے لئے تمام طبی سہولتیں موجود ہیں۔ حیدرآباد میں فیملی پلاننگ سنٹرس کی جملہ تعداد 28 ہے۔ زچگی خانے اور بہبودی اطفال کے مراکز کی جملہ تعداد 27 ہے۔

حیدرآباد کے تمام دواخانوں میں ان پیشنٹس کے لئے 5783 بستروں کا انتظام ہے۔ ان کے علاوہ نرسنگ ہومس میں ان کا شمار 1057 ہے۔

عثمانیہ دواخانہ، گاندھی میڈیکل ہاسپٹل اور نامپلی دواخانہ میں عام بیماریوں اور امراض کہنہ کا

علاج ہوتا ہے۔ نظامس آرتھوپیڈک ہاسپٹل میں ہڈیوں اور اعصابی امراض کے مبتلا شریک ہوتے ہیں۔ ای این ٹی ہاسپٹل میں ناک، کان اور حلق کی بیماریوں کا علاج ہوتا ہے۔ وکٹوریہ ہاسپٹل، کونٹھی ہاسپٹل اور نیلوفر ہاسپٹل، زچگی اور امراض اطفال کے لئے مخصوص ہیں۔ کینسر ہاسپٹل میں مختلف اقسام کے کینسر میں مبتلا مریضوں کا علاج ہوتا ہے۔ ٹی بی ہاسپٹل، امراض سینہ و دق کے علاج کے لئے مختص ہے۔ فیور ہاسپٹل کو کورنٹی دواخانہ کہا جاتا ہے۔ یہاں پر شدید اور کہنہ قسم کے امراض کا علاج ہوتا ہے و نیز متعدی بیماریوں کے لئے علاج کا یہاں خصوصی انتظام ہے۔ دماغی امراض کا دواخانہ ایرہ گڈہ میں واقع ہے۔ سروجنی دیوی آئی ہاسپٹل میں آنکھوں کا علاج ہوتا ہے۔ اس دواخانہ کے زیر اہتمام سال میں کئی بار آئی کیمپ بھی لگائے جاتے ہیں جہاں غرباء کا مفت معائنہ ہوتا ور انہیں عینکیں دی جاتی ہیں۔

* * *

حیدرآباد کے کلبس

کلب تمدن و مہذب معاشرہ میں سماجی سرگرمیوں کا اہم ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ حیدرآباد میں کلبس کے قیام کا سہرا انگریزوں کے سر ہے۔ یہاں کے قدیم کلبس میں سکندرآباد کے کلب کو اولیت حاصل ہے۔ ابتداء یہ ایک تہذیبی ادارہ تھا۔ 26/ اپریل 1878ء کو قائم ہوا۔ آج اس کے ممبرس کی تعداد 2000 سے زیادہ ہے۔

نظام کلب نظام کلب 26/ ستمبر 1884ء کو قائم ہوا۔ سالار جنگ دوم اس کے بانی ہیں۔ اس میں ملکی افراد ہی کو ممبرشپ دی جاتی تھی۔ شہر کے شرفاء کے لئے یہاں مختلف تہذیبی سرگرمیاں تھیں۔ آج بھی یہاں مغرب اور مشرق کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ اس وقت نظام کلب کے 1000 سے زائد ممبر ہیں۔

فتح میدان کلب یہ کلب 1963ء میں قائم کیا گیا۔ یہ کلب قومی یکجہتی کا عظیم ادارہ مانا جاتا ہے۔

حیدرآباد کے بنک

حیدرآباد میں بنک کاری کا نظام ابتداً خانگی اداروں کے تحت تھا۔ بعد میں مملکت حیدرآباد کے نظم و نسق اور معیشت کو مستحکم بنانے کے لئے و نیز حکومت کے محفوظات کو یکجا کر کے خزانہ جات پر نگرانی کی غرض سے اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد کا قیام 1942ء میں لایا گیا۔

امپریل بنک آف انڈیا کے عہدہ دار جناب علی حیدری کی خدمات حاصل کی گئیں جنھوں نے نہ صرف شہر حیدرآباد بلکہ اضلاع میں بھی کئی شاخیں قائم کیں۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کے دیگر بڑے شہروں میں بھی اس کی برانچس کھولی گئیں۔

حیدرآباد میں اس وقت کئی بیرونی، قومی اور خانگی بنک موجود ہیں جن کی تعداد 500 سے زائد ہے۔

حیدرآباد کی جامعات

حیدرآباد میں تعلیمی ترقی قابل رشک ہے۔ یہاں اس وقت کئی جامعات قائم ہیں جن میں اولیت عثمانیہ یونیورسٹی کو حاصل ہے۔ علاوہ ازیں جواہر لال نہرو ٹکنیکل یونیورسٹی، آندھرا پردیش اگریکلچر یونیورسٹی، یونیورسٹی آف حیدرآباد اور ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، تلگو یونیورسٹی۔

عثمانیہ یونیورسٹی

عثمانیہ یونیورسٹی 5/ اکٹوبر 1918 ء کو قائم ہوئی۔ اس جامعہ کے قیام کے لئے اس وقت کے فرمانروا نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف جاہ سابع نے ایک فرمان جاری کیا تھا۔ اس جامعہ کا نام انہی کے نام پر رکھا گیا۔ یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ سر اکبر حیدرآبادی نے بنایا تھا۔ اس منصوبہ میں طلباء کے قیام کے لئے ہاسٹل، عملہ کے لئے کوارٹرس، مختلف کلیہ جات، کتب خانے، ہال اور کھیل کے میدان بھی شامل تھے۔

جامعہ عثمانیہ کے لئے 1612 ایکر زمین مختص کی گئی جس میں سے 184 ایکر زمین مختلف اداروں کو دی گئی جو بیرون شہر قائم کئے جانے والے تھے۔ جامعہ عثمانیہ تدریسی اور توثیقی حیثیت رکھتی ہے۔ 1959 ء میں آندھراپردیش اسمبلی کے ایک بل کی منظوری کے ساتھ ہی 1947 ء سے 1959 ء تک جامعہ عثمانیہ کا ادارہ جاتی خوداختیارانہ موقف تبدیل ہوگیا اور یہ جامعہ مکمل طور پر حکومت کے زیر تصرف و نگرانی قرار پائی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کا تعلیمی حلقہ اثر بہ لحاظ قانون آندھراپردیش کے حسب ذیل اضلاع تک ہے۔ عادل آباد، حیدرآباد، کریم نگر، کھمم، محبوب نگر، میدک، نلگنڈہ، رنگاریڈی اور نظام آباد۔ یونیورسٹی کے 7 کالجس کیمپس میں کام کرتے ہیں۔ کیمپس کے باہر 12 کالجس ہیں۔ 166 (بشمول اورینٹل کالجس) جامعہ سے ملحق ہیں۔

1983-84 ء میں جامعہ عثمانیہ میں جملہ (78130) طلباء وطالبات نے داخلہ حاصل کیا تھا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی ایک نہایت عالیشان اور وسیع لائبریری ہے جس میں 500 نشستوں کا انتظام ہے۔ لائبریری میں 3,28,477 کتابیں اور 13 ہزار رسائل اور میقاتی جرائد 1983-84 ء کے سروے کے وقت موجود تھے۔

جامعہ عثمانیہ میں یو.جی.سی کی جانب سے منظورہ ایک سنٹر آف اڈوانسڈ اسٹیڈی بھی قائم ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی جانب سے وسیع پیمانے پر ریسرچ کے طلباء کو اسکالرشپ اور فیلوشپ عطا کئے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی کی جانب سے خانگی اور کرسپانڈنس کورسس بھی مشروط طریقہ پر جاری ہیں۔ جامعہ کا تعلیمی سال دو میقات پر مبنی ہوتا ہے۔ جولائی / اگست میں داخلے دیئے جاتے ہیں۔ امتحانات اپریل / مئی اور سپلمنٹری امتحانات اکٹوبر / نومبر میں منعقد ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی کا بجٹ سالانہ تقریباً 9 کروڑ روپئے کا ہوتا ہے فیسوں کی آمدنی اس کا 10 فیصد ہوتی ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے 12 ہاسٹل ہیں جن میں 2420 طلباء کے قیام کی گنجائش ہے جن کے منجملہ 114 طالبات کے لئے مختص ہیں۔ بورڈنگ چارجس لگ بھگ 200 روپئے ماہانہ اور ہاسٹل

فیس 20/22 روپئے ماہانہ ہے۔ یونیورسٹی کی جانب سے طبی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ نوجوانوں کے لئے خصوصی ویلفیر پروگرام اور تعلیم بالغان کے مراکز بھی یونیورسٹی کی جانب سے قائم ہیں۔ یونیورسٹی گیمس اینڈ اسپورٹس پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔ این ایس ایس اسکیم بھی یونیورسٹی کے پروگرام میں شامل ہے۔

آرٹس اینڈ سوشیل سائنس فیکلٹی کے تحت بی اے، بی ایس ڈبلیو، ایم اے، ایم اے (آنرز)، بی سی جے، ایم سی جے، بی لب ایس سی (لائبریری سائنس) ایم لب ایس سی، بی اے ایل، ایم اے ایل اور کئی تربیتی و تعلیمی ڈپلوما دیئے جاتے ہیں۔ نامل سرٹیفکٹس کورس بھی ہے۔

فیکلٹی آف سائنس میں بی ایس سی، ایم ایس سی، بی ایس سی (کیمیکل ٹکنالوجی) ایم ایس سی (میاتھمس) ایم ایس سی (ٹکنالوجی / جغرافی) ایم ایس سی (بائیڈرولوجی) ایم ایس سی (الکٹرانکس) اور دیگر سرٹیفکٹ کورس کے لئے طلباء کو تعلیم دیجاتی ہے۔

فیکلٹی آف کامرس۔ بی کام، بی کام (آنرس) ایم کام، ایم بی اے کا کورس

فیکلٹی آف ایجوکیشن میں بی ایڈ، ایم ایڈ، بی پی ایڈ اور ڈپلوما کورس۔

فیکلٹی آف لا میں ایل ایل بی، ایل ایل ایم کا کورس

فیکلٹی آف انجینئرنگ۔ بی ای، ایم ای، ایم ٹیک (کمپیوٹر سائنس) اور ڈپلوما کورس

فیکلٹی آف ٹکنالوجی۔ بی ٹیک، ایم ٹیک کورس

فیکلٹی آف میڈیسن۔ ایم بی بی ایس، ایم ڈی، ایم ایس، ایم سی ایچ، بی ڈی ایس، ایم ڈی ایس، بی ایس سی نرسنگ، ایم ایس سی (نیوٹریشن) بی ایچ ایم ایس اور ڈپلوما کورس۔

فیکلٹی آف ایورویدا و یونانی بی اے ایم ایس، بی یو ایم ایس، کایاچکتسیا۔ مولجت اور ڈپلوما کورس

ریسرچ ڈگریاں۔ ایم فل، اور ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی)

آندھراپردیش اگریکلچرل یونیورسٹی

زرعی جامعہ کے قیام کی تجویز حکومت آندھراپردیش نے 1957ء میں منظور کی۔ اس سلسلہ میں عملی اقدام کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی کی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کی سفارشات کی اساس پر ایک بل ریاستی اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ آندھراپردیش اگریکلچرل یونیورسٹی ایکٹ اسمبلی نے 1963ء میں منظور کیا۔ یونیورسٹی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز 12/ جون 1964ء سے کیا۔

اس یونیورسٹی کا علاقہ اثر پوری ریاست کے حدود کو قرار دیا گیا۔ یعنی اس جامعہ کو زرعی تعلیم کے ضمن میں آندھراپردیش کے کسی بھی حصہ میں تعلیم، تحقیق اور توسیعی پروگرام کا اختیار

دیا گیا۔ وٹرنری اور ہوم سائنس کے موضوعات بھی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کئے گئے۔ اس جامعہ کا قیام حیدرآباد کے علاقہ راجندر نگر عمل میں لایا گیا۔ یہی مرکز بھی قرار دیا گیا۔ اس یونیورسٹی سے متعلق 3 کالجس تسلیم کئے گئے۔ کالج آف اگریکلچر، کالج آف وٹرنری اور کالج آف ہوم سائنس۔ یونیورسٹی کے دو ذیلی کیمپس بنانے گئے۔ ان کیمپس سے متعلق دو، دو کالجس کو تسلیم کیا گیا۔

پہلا کیمپس تروپتی (ضلع چتور) اور دوسرا باپٹلہ (ضلع گنٹور)۔ تروپتی میں کالج آف اگریکلچر اور کالج آف وٹرنری سائنس کھولے گئے جبکہ گنٹور کے باپٹلہ کیمپس میں کالج آف اگریکلچر اور کالج آف ہوم سائنس شروع کئے گئے۔

حیدرآباد میں ان جملہ 7 کالجس کے علاوہ ایک اگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجندر نگر میں قائم کیا گیا اور 49 ریسرچ اسٹیشن شروع کئے گئے جو سب کے سب زرعی جامعہ سے متعلقہ و منظورہ ہیں۔

زرعی جامعہ راجندر نگر میں ایک مرکزی لائبریری قائم ہے۔ دو علاقائی کتب خانہ اسی کے تحت تروپتی اور باپٹلہ میں قائم ہیں۔ مرکزی لائبریری میں کم از کم 71000 کتب موجود ہیں۔ 500 سے زیادہ رسائل و جرائد منگوائے جاتے ہیں۔

جامعہ زرعی حیدرآباد میں انڈر گریجویٹس کی جن کے سرپرستوں کی آمدنی ہزار روپئے ماہانہ سے کم ہو، فیس نہیں لی جاتی۔ پسماندہ اقوام اور قبائیلیوں سے کھانے کے اخراجات نہیں لئے جاتے۔ انہیں ہر ماہ 25 روپئے کا وظیفہ جیب خرچ بھی یونیورسٹی دیا کرتی ہے۔ حکومت کی جانب سے پوسٹ گریجویٹ طلباء کے لئے 575 تا 600 روپئے کا خصوصی الونس بھی جاری کیا جاتا ہے

زرعی جامعہ آندھراپردیش میں خانگی یا اکسٹرنل اساس پر طلباء کو شریک امتحان نہیں کیا جاتا۔

زرعی جامعہ میں فیکلٹی آف اگریکلچرل کے تحت بی ایس سی (اگریکلچرل) بی ایس سی (ہارٹیکلچر) ایم ایس سی (اگریکلچر) بی ٹیک (اگریکلچرل انجینئرنگ) کی ڈگریاں دی جاتی ہیں۔

فیکلٹی آف وٹرنری سائنس کے تحت بی وی ایس سی اینڈ اے ایچ، ایم وی ایس سی، بی ایس سی (ڈائری ٹکنالوجی) کے کورسس ہیں۔

فیکلٹی آف ہوم سائنس کے تحت بی ایس سی (ہوم سائنس) اور ایم ایس سی (ہوم سائنس) کی تعلیم دی جاتی ہے۔

تینوں فیکلٹی میں تحقیق کرنے والے ریسرچ اسکالرس کو ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کی ڈگری عطا کی جاتی

ہے۔1983ء کے سالانہ امتحانات کے موقع پر یونیورسٹی کے نتائج اس طرح تھے۔

بی ایس سی (اگری) 361 طلباء کے منجملہ 112 درجہ اول، 232 درجہ دوم اور 17 درجہ سوم میں کامیاب ہوئے۔ ایم ایس سی (اگری) 119 طلباء کے منجملہ 103 درجہ اول، 16 درجہ دوم میں پاس تھے۔ بی وی ایس سی۔ 160 طلباء شریک امتحان تھے ان میں سے 23 درجہ اول، 55 درجہ دوم اور 82 درجہ سوم میں کامیاب ہوئے۔ ایم وی ایس سی میں 26 کے منجملہ 23 درجہ اول اور 3 درجہ دوم میں آئے۔ بی ایس سی (ہوم سائنس) میں 51 طلباء شریک امتحان ہوئے 33 درجہ اور 18 درجہ دوم میں کامیاب تھے۔ ایم ایس سی (ہوم سائنس) میں 10 کے منجملہ 8 درجہ اول اور 2 درجہ دوم میں کامیاب ہوئے۔

آندھراپردیش اوپن یونیورسٹی

آندھراپردیش اوپن یونیورسٹی، ریاستی مجلس مقننہ کے پاس کردہ ایک قانون کی رو سے اگست 1982ء میں قائم ہوئی۔ اس کا افتتاح صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

اے پی اوپن یونیورسٹی کا سب سے اہم مقصد ان لوگوں کو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ مند کرنا ہے جنھیں کسی وجہ سے اعلیٰ تعلیم کے حصول میں دشواری ہے یا جنھیں جامعاتی سطح پر تعلیم حاصل کرنے کے مواقع حاصل نہیں ہیں۔ اوپن یونیورسٹی ایسے افراد کو جن کی عمر 20 سال سے متجاوز ہے انھیں بلاکسی تعلیمی صداقت نامہ کے اعلیٰ تعلیم کی سہولت بہم پہنچاتی ہے۔ وہ تمام لوگ جو زندگی کے کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی عقیدہ و [illegible] کے حامل ہیں اس جامعہ سے اعلیٰ تعلیمی اسناد حاصل کرسکتے ہیں۔ اس کے لئے انہیں حاضری ترتیب یا کسی خاص مقام پر اکٹھا ہونے کی بھی حاجت وضرورت نہیں۔ وہ گھر بیٹھے امتحان کی تیاری کرسکتے ہیں۔ یونیورسٹی انہیں پوسٹ تلم ریڈیو، ٹی وی اور دیگر ذرائع سے نصابی مواد فراہم کرتی ہے۔ اس یونیورسٹی میں 20 سال سے زائد کسی بھی عمر کے لوگ داخل ہوسکتے ہیں اور اپنا من چاہا کورس لے سکتے ہیں۔

اوپن یونیورسٹی نے حیدرآباد اور سکندرآباد میں کئی اسٹڈی سنٹرس قائم کئے ہیں ان کے علاوہ اضلاع میں بھی ایسے مراکز قائم ہیں۔ سارے ملک میں کہیں سے بھی اوپن یونیورسٹی میں داخلہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اس یونیورسٹی کو حیدرآباد میں سوماجی گوڑہ میں قائم کیا گیا ہے۔ 84-1983ء میں اوپن یونیورسٹی میں 6406 رجسٹریشن ہوئے جس کے منجملہ 1327 خواتین نے اپنے نام داخل کئے۔ یونیورسٹی کی جانب سے طلباء کو ذریعہ ڈاک مطبوعہ نصابی مواد فراہم کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یونیورسٹی میں لائبریری اور لیباریٹری کی سہولت بھی مہیا ہے۔

اوپن یونیورسٹی پسماندہ طبقات اور معاشی حیثیت سے کمزور طلباء کے لئے رعایتی فیس کا پیشکش کرتی ہے اور مستحق طلباء وطالبات کو تعلیمی وظائف بھی جاری کئے جاتے ہیں۔ تعلیمی سال بالعموم جولائی / اگسٹ سے رکھا گیا ہے۔

اوپن یونیورسٹی میں گریجویشن کی سطح تک تعلیمی اسناد دیئے جاتے ہیں جن میں بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے فاؤنڈیشن کورس شامل ہیں۔ اوپن یونیورسٹی میں چار فیکلٹیز ہیں۔ آرٹس، سوشیل سائنس، کامرس اور سائنس۔ آندھراپردیش کے تمام اضلاع میں اسٹڈی سنٹرس قائم کئے گئے ہیں

اوپن یونیورسٹی نے بی ایل ایس سی (لائبریری سائنس) کے علاوہ پبلک اکاؤنٹنگ کا ڈپلوما کورس بھی شروع کیا ہے۔

یونیورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد کے قدیم مضافاتی علاقہ گچی باؤلی میں یونیورسٹی قائم ہے۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد، پارلیمنٹ میں پاس شدہ قانون نمبر39 / 1974ء کے زیر اثر 2 / اکتوبر 1974ء کو قائم کی گئی، اسی دن سے وہ اپنے علمی منصب کی تکمیل کر رہی ہے۔ اس یونیورسٹی کے دائرہ اثر کو پوری ریاست آندھراپردیش تک وسعت دی گئی ہے۔ ایسے تعلیمی اور فنی ادارے جو کسی یونیورسٹی سے ملحق یا منظورہ نہیں ہیں اس جامعہ سے مربوط کئے جاسکتے ہیں۔

یونیورسٹی آف حیدرآباد میں ریاضی، کمپیوٹر، انفارمیشن سائنس، فزکس، سوشیل اسٹڈیز کے ادارے ہیں۔ علاوہ ازیں شعبہ ہائے فلسفہ، انگریزی، ہندی، اکنامکس، تاریخ، پولیٹکل سائنس، سوشیل اور انتھراپالوجی، علاقائی اسٹڈیز، عمرانیات وغیرہ قائم کئے گئے ہیں۔

یونیورسٹی آف حیدرآباد میں لائبریری اور ریسرچ کی تمام تر سہولتیں موجود ہیں۔ 1983ء میں طلباء کی تعداد 690 تھی۔ لائبریری کا سالانہ بجٹ اوسطاً 25 لاکھ روپئے ہے۔ طلباء کو کئی اقسام کے تعلیمی وظائف دیئے جاتے ہیں۔ تعلیمی سال کو دو میقات میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ داخلے جولائی میں ہوتے ہیں اور امتحانات ڈسمبر اور مئی میں لئے جاتے ہیں۔

یونیورسٹی کا سالانہ بجٹ 176.76 لاکھ روپئے 1983ء میں منظور کیا گیا تھا۔ فیسوں سے متذکرہ سال جملہ آمدنی 20.18 لاکھ روپئے ہوئی۔ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں 222 طلباء اور 81 طالبات کے قیام کی گنجائش ہے۔ ہاسٹل کی فیس سالانہ 240 روپئے لی جاتی ہے اور ماہانہ اخراجات طعام 250 روپئے وصول کئے جاتے ہیں۔

یونیورسٹی آف حیدرآباد، ایم اے، ایم ایس سی، ایم ٹیک، ایم سی اے، کمپیوٹر

ڈپلوما کورس، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں عطا کرتی ہے۔

کالجس

حیدرآباد میں اعلیٰ تعلیم کا رواج زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ باضابطہ کلیہ جاتی سطح پر اس کا انتظام آصفجاہی بادشاہوں کے عہد میں ہوا اور مسلسل روبہ ترقی رہا۔

حیدرآباد کالج اس سلسلہ کی سب سے اہم کڑی ہے۔ شہر حیدرآباد میں یہ پہلا کالج تھا جو 1878ء میں قائم ہوا۔ اس کالج کو چادر گھاٹ ہائی اسکول کی عمارت میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کالج کے پہلے صدر کی حیثیت سے ڈاکٹر رگھوناتھ چنو پادھیا نے خدمت انجام دی۔

نظام کالج 1888ء میں قائم ہوا۔ اس کا مدراس یونیورسٹی سے الحاق تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد اسے اس جامعہ سے متعلق کردیا گیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام تک حیدرآباد میں فنی تعلیم کے چند ادارے قائم ہوچکے تھے۔ علوم متداولہ کی کلیہ جاتی سطح کی تعلیم کی غرض سے حیدرآباد میں قائم کالجس اپنی تعداد اور معیار کے لحاظ سے پورے ہندوستان میں بے مثال تسلیم کئے جاتے ہیں۔ چند کلیہ جات کے نام یہ ہیں۔

جاگیردار کالج، ریذیڈنسی (زنانہ) کالج، عثمانیہ میڈیکل کالج، آرٹس کالج (جامعہ عثمانیہ) لا کالج، انجینئرنگ کالج، سائنس کالج (سیف آباد) ویویک وردھنی کالج، نانک رام بھگوان داس کالج، انوارالعلوم کالج، ممتاز کالج، پی جی کالج، ایڈمنسٹریٹیو اسٹاف کالج، کالج آف ٹکنالوجی، راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی ویمنس کالج، ہندی آرٹس کالج، اردو آرٹس کالج، نظامیہ طبی کالج، کالج آف فائن آرٹس اینڈ آرکیٹکچر، ہوم سائنس کالج، کالج آف نرسنگ، آدرش کالج، کالج آف وٹرنری سائنس، بدروکا کالج، اے کے نوجیون کالج، کالج آف ایجوکیشن، سٹی کالج، شریمتی ستیما نرسمباراؤ میموریل کالج، اسٹیٹ بنک آف انڈیا ٹریننگ کالج، راجندر پرشاد کالج آف ماس کمیونکیشن، کالج آف لنگویجس، گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن، عثمانیہ میڈیکل کالج، گاندھی میڈیکل کالج، ایورویدا کالج، انوارالعلوم ویمنس کالج، گورنمنٹ کالج فار ویمنس بیگم پیٹ، کالج آف فزیکل ایجوکیشن، اسٹاف ٹریننگ کالج جامعہ عثمانیہ، گورنمنٹ کامپرہنسیو کالج آف ایجوکیشن، ایس ڈی سگنوڈیا کالج، جے این ٹی یو انجینئرنگ کالج، ونیتا مہاودیالیہ، کملا نہرو پالی ٹکنک، سکندرآباد کالج، پرنس شہکار کالج، بابو جگجیون رام کالج، پرنسس عیسن کالج، اسٹینلی جونیئر کالج، شاداں جونیئر کالج، دھرم ونت جونیئر کالج، انوارالعلوم جونیئر کالج، نامپلی جونیئر کالج، محبوبیہ جونیئر کالج، حسینی علم جونیئر کالج، حسینی علم گرلز کالج، نریڈیومین کالج، کملا نہرو گرلز پالی ٹکنک کالج، عالیہ جونیئر کالج، علی آباد جونیئر کالج، کاچیگوڑہ جونیئر کالج، جواہرلال نہرو پالی ٹکنک، چنچل گوڑہ جونیئر کالج، اگروال سائنس کالج، تلگو کلاشالہ، ریڈی کالج،

آندھرا مہاودیالیہ، لطیفیہ عربی کالج، اے کے ایم عربی کالج، نوریہ کالج، گورنمنٹ پالی ٹکنک، مفخم جاہ انجینئرنگ کالج، دکن میڈیکل کالج، دکن انجینئرنگ کالج، اعزہ جونیئر کالج وغیرہ۔

حیدرآباد میں جملہ 38 ڈگری کالجس قائم ہیں جبکہ جونیئر کالجس (اعلیٰ ثانوی مدارس) کی حقیقی تعداد 45 ہے۔ اس طرح جملہ جونیئر اور ڈگری کالجس کی تعداد 83 ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں پیشہ ورانہ تعلیم جیسے طب، قانون، انجینئرنگ، اور ٹکنالوجی کے کالجس بھی موجود ہیں۔ اوپر دیئے گئے ناموں کے منجملہ 5 کالجس طبی تعلیم کے لئے مخصوص ہیں جن میں 2 ایلو پیتھی، ایک ایورویدک، ایک یونانی اور ایک ہومیو پیتھی طریقہ تعلیم کے کالج ہیں۔ حیدرآباد میں ایک لا کالج، 4 انجینئرنگ کالجس اور 3 پالی ٹکنک کالجس موجود ہیں۔

مدارس

حیدرآباد میں علوم و فنون اور تعلیم و تدریس سے دلچسپی ابتداء ہی سے ملتی ہے۔ سلاطین قطب شاہیہ چوں کہ خود اعلیٰ تعلیمیافتہ اور علم دوست تھے، انہیں رعایا کی تعلیم سے بے حد دلچسپی تھی چنانچہ حیدرآباد کی تعمیر کے ساتھ ساتھ انھوں نے فروغ تعلیم کے لئے منصوبہ بند طریقے سے مدارس قائم کئے اور بہترین علماء کو درس و تدریس کے لئے مقرر کیا تھا۔ ماضی میں طلباء کو ضروری تعلیم دینے کے لئے مکتب کا رواج تھا۔ اساتذہ کو بطور اجرت نقد رقم کے بجائے اجناس اور ضرورت کی چیزیں دی جاتی تھیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے حیدرآباد میں باضابطہ "مدرسہ" قائم کر کے تعلیمی نظام کو مستحکم کیا۔

حیدرآباد کی پہلی درس گاہ چارمینار سے متصل جامع مسجد میں قائم ہوئی۔ اس مدرسہ کو سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنے دور حکومت میں تعمیر کروایا تھا۔

حیدرآباد کا دوسرا اہم مدرسہ نواب محمد فخرالدین خاں شمس الامراء ثانی کا قائم کردہ تھا جسے انھوں نے اپنی دیوڑھی شاہ گنج کے ایک حصہ میں قائم کیا تھا اور مدرسہ فخریہ کہلاتا تھا۔ یہاں نہ صرف علوم دینیہ بلکہ عصری علوم کی تعلیم کا اعلیٰ پیمانے پر انتظام تھا۔ یہ مدرسہ بعد میں شمس آباد منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس مدرسہ کی بنا 1843ء میں ہوئی۔

نواب ناصرالدولہ بہادر آصف جاہ رابع کے عہد میں حیدرآباد میں پہلی مرتبہ مدرسہ طبابت قائم ہوا۔ یہ مدرسہ 1845ء میں شروع ہوا بعد میں بہت ترقی کیا۔

دارالعلوم 1856ء میں قائم ہوا جسے سر سالار جنگ بہادر نے اپنی دیوڑھی کے ایک حصہ میں قائم کیا۔ اس مدرسہ نے بے حد ترقی کی۔ اس کا شعبہ انگریزی بعد میں سٹی کالج بنا۔

1873ء میں نارمل اسکول قائم ہوا بعد میں اسکا دارالعلوم میں انضمام عمل میں آیا۔

1878 ء میں مدرسہ اعزہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس مدرسہ میں امراء اور جاگیرداروں کے بچوں کو ہی داخلہ دیا جاتا تھا۔ بعد میں شاہی خاندان کے طلباء بھی اسی میں پڑھنے لگے۔ یہ مدرسہ آج بھی ملک پیٹ میں موجود ہے۔

1879 ء میں مدرسہ عالیہ کی بنا رکھی گئی۔ اس مدرسہ میں شہزادگان اور امراء کے بچے داخل کئے جاتے تھے۔ عام لوگوں کے لڑکوں کو یہاں شریک نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ حیدرآباد کا اعلیٰ ترین مدرسہ تھا۔ اس کا معیار تعلیم بہت بلند تھا۔

حیدرآباد کے قدیم ترین انگریزی ذریعہ تعلیم کے مدارس میں پہلا نام سینٹ جارجس گرامر اسکول کا ملتا ہے جو 1834 ء میں قائم ہوا۔ اسی زمانے میں چند دیگر مدارس بھی وجود میں آئے۔ ان میں آل سینٹس ہائی اسکول، گرامر اسکول بلارم، رومن کیتھولک مشن اسکول، ایس پی جے اسکول، ریذیڈنسی ورناکولر اسکول شامل ہیں۔ علاوہ ازیں چند اہم انگریزی میڈیم اسکول یہ ہیں۔ میتھوڈسٹ اسکول (بوائز اینڈ گرلز)، سینٹ پال اسکول، سینٹ اینس اسکول، اسٹینلی اسکول، لٹل فلاور ہائی اسکول، بوائز ٹاؤن، حیدرآباد پبلک اسکول، وغیرہ۔ قیام آندھراپردیش کے بعد سے حیدرآباد میں انگریزی میڈیم اسکولس کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ سرکاری اور خانگی سطح پر چلنے والے مدارس کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔

1879 ء میں حیدرآباد کے رہنے والے کھتری طبقہ نے ایک مدرسہ شروع کیا جس کا نام مفید الانام رکھا۔

1880 ء میں کالستھ طبقہ کے لوگوں نے ایک مدرسہ قائم کیا جسے دھرم ونت اسکول سے موسوم کیا گیا۔ یہ آج کل کالج بن گیا ہے۔

مدرسہ نظامیہ

حیدرآباد میں علوم دینیہ کی ترویج و ترقی اور اشاعت علوم کے ضمن میں مدرسہ نظامیہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس وقت پوری دنیا میں اپنی قدامت کے لحاظ سے اس کا دوسرا مقام ہے۔ یہ مدرسہ 1883 ء میں قائم کیا گیا۔ ابتداء ہی سے اس مدرسہ میں مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء کے قیام و طعام کا بھی مدرسہ کی جانب سے بلامعاوضہ انتظام ہے۔ اقامت خانہ اور طعام کے تمام انتظامات مدرسہ کی مجلس منتظمہ کی جانب سے کیا جاتا ہے۔

نواب آصف جاہ سادس نے کسارٹہ میں ایک عمارت مدرسہ کو عطا فرمائی تاکہ طلباء کی رہائش اور مدرسہ کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ نواب مرحوم نے ماہانہ امداد بھی جاری فرمائی جب مدرسہ روزافزوں ترقی پانے لگا اور طلباء کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تو نواب آصف جاہ سابع نے

نہ صرف مدرسہ کی اعانتی رقم میں کئی گنا اضافہ کیا بلکہ ایک وسیع عمارت بھی دی۔ یہ مدرسہ اب جامعہ نظامیہ سے موسوم ہے اس کی عالیشان عمارت شبلی گنج میں واقع ہے۔ 1948ء کے بعد سے جامعہ نظامیہ عوامی اعانتوں کی اساس پر اپنے اخراجات کی پابجائی کر رہا ہے۔

مدارس کی موجودہ صورتحال

حیدرآباد میں ہر دور میں تعلیمی ترقی پر بطور خاص توجہ دی گئی۔ بنیادی تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر ابتدائی سطح سے ہی باضابطہ تدریسی نظام، زمانہ قدیم سے رائج ہے اور اس میں بڑھتی ہوئی آبادی اور تعلیمی شعور کی بیداری کے سبب بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ حیدرآباد میں سینکڑوں مدارس حکومت اور خانگی انتظامیہ کے زیر اہتمام چل رہے ہیں۔

محکمہ مردم شماری کی جانب سے جاریہ ایک رپورٹ کے بموجب اس وقت شہر حیدرآباد کے بلدی حدود میں 736 تحتانوی مدارس، 457 وسطانی مدارس اور 251 ہائی اسکول کام کر رہے ہیں علاوہ ازیں 45 اعلیٰ ثانوی سطح کے اسکول موجود ہیں۔ شہری حدود کے علاوہ عوالی و اطراف شہر کم از کم 96 تحتانوی مدارس، 46 وسطانی مدارس، 26 فوقانی مدارس اور 2 اعلیٰ ثانوی مدرسے قائم ہیں۔

ان مدارس کے علاوہ ٹائپ رائٹنگ، شارٹ ہینڈ، میوزک اور ڈانس کے کئی مسلمہ ادارے کام کر رہے ہیں۔ چھٹیوں کے دوران تعطیلاتی تربیتی اداروں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ نصابی تعلیم سے الگ ان عام تعلیمی و تربیتی اداروں کی تعداد 261 ہے۔ یہ ادارے سماجی خدمت اور تجارتی بنیاد پر چلتے ہیں اور سال میں ایک یا دو بار امتحان منعقد کر کے سرٹیفکٹ بھی دیتے ہیں۔

حیدرآباد میں تعلیم بالغان کے مراکز کی تعداد 277 ہے۔ یہاں ایسے ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے لوگوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہوتا ہے جو بچپن کی شادی، معاشی، سماجی اور اقتصادی بدحالی کے شکار ہو کر اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری نہیں رکھ پاتے ہیں۔

حیدرآباد کے اکثر اچھے اور بڑے مدارس عابد روڈ کے علاقہ میں واقع ہیں۔ آر ٹی سی کی جانب سے طلباء کو شہر کے مختلف حصوں سے آمد و رفت کی سہولت موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ کارپوریشن نے کئی اسکول بسیں بھی چلانی شروع کی ہے۔ حیدرآباد کے چند مشہور مدارس یہ ہیں۔ گرامر اسکول، آل سینٹس اسکول، حیدرآباد پبلک اسکول، میتھوڈسٹ اسکول، گوشہ محل اسکول، چادر گھاٹ ہائی اسکول، اعزہ اسکول، محبوبیہ گرلز اسکول، اشرف المدارس، منہاج الشرقیہ، مفید الانام اردو شریف، انوار العلوم، مدرسہ آصفیہ، مدینہ پبلک اسکول، سٹی ہائی اسکول، نامپلی ہائی اسکول، کالستھ پاٹھ شالہ، خادم المسلمین، رفاہ المسلمین، کاچیگوڑہ ہائی اسکول، چنچل گوڑہ ہائی اسکول وغیرہ۔

کتب خانے

حیدرآباد میں علوم وفنون سے دلچسپی کا سب سے بڑا ثبوت گذشتہ چار سو برس سے اس شہر کی علمی، ادبی، تعلیمی اور تدریسی سرگرمیوں کے علاوہ تصنیف وتالیف اور کتابوں کی طباعت واشاعت و نیز ان کے جمع کرنے کے ذوق سے ملتا ہے۔ حیدرآباد کو اگر کتب خانوں کا شہر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

سلاطین قطب شاہیہ کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ ان کے عہد میں علوم کی نشر و اشاعت کا بہت موثر انتظام تھا۔ شاہی کتب خانے میں مختلف علوم وفنون کی نادر قلمی کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ بادشاہوں کی طرح امراء، روساء اور علماء کے اپنے ذاتی کتب خانے تھے جہاں دنیا بھر کے موضوعات پر بہترین کتابیں تھیں۔

حیدرآباد کی تاسیس کے وقت گولکنڈہ سے شاہی کتب خانہ یہاں منتقل کیا گیا تھا۔ خاندان آصفیہ کے تاجداروں کو بھی فروغ علم سے بے حد لگاؤ تھا۔ ان کے کتاب خانوں میں بھی ہزاروں نادر کتابیں موجود تھیں۔ حکمرانوں کی طرح امراء بھی اپنے ذاتی کتب خانے رکھتے تھے۔ نواب شمس الامراء کا کتب خانہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے حد منفرد اور بہت بڑا تھا۔ یہاں علوم دین و دنیا سے متعلق مختلف موضوعات پر کتابیں دستیاب تھیں۔

حیدرآباد کے تقریباً تمام اہم تعلیمی اداروں یعنی جامعات، کلیہ جات اور مدارس کے اپنے کتب خانے ہیں۔ حیدرآباد کا مرکزی کتب خانہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری ہے جس کا قدیم نام کتب خانہ آصفیہ تھا جس کو 1891ء میں سید حسن بلگرامی نے قائم کیا تھا۔ 1939ء میں موجودہ عمارت 3 لاکھ کے صرفہ سے تعمیر کی گئی۔ کتاب خانہ عمر یافعی، کتاب خانہ محب حسین، کتاب خانہ سید علی بلگرامی، کتب خانہ مولوی چراغ علی، کتاب خانہ سید محمد قاسم (پتھر گٹی) کتب خانہ سید محمد بیدری، کتاب خانہ جامعہ نظامیہ۔ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، کتب خانہ سعیدیہ، کتب خانہ سالار جنگ میوزیم، کتب خانہ سرامین جنگ، حیدری گشتی کتب خانہ، کتب خانہ سرنظامت جنگ بہادر، شعیب میموریل لائبریری، گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹس لائبریری، کتب خانہ شمس اللہ قادری، ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری، کتب خانہ بزم خواتین دکن، بھارت گن وردھک سمستھا، برٹش لائبریری، سٹی لائبریری، کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو اور گشتی کتب خانہ عابد روڈ، کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔

حیدرآباد میں 38 پبلک لائبریریاں اور 101 ریڈنگ روم (مطالعہ گھر) موجود ہیں جہاں بڑی تعداد میں مختلف زبانوں میں علوم وفنون کی ہزاروں کتابیں ملتی ہیں۔ ان کتب خانوں میں ناول،

رسائل، اخبارات، روزانہ، ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور مجلے (ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور ماہانہ) منگوائے جاتے ہیں۔ یہ اخبارات و رسائل سیاسی، سماجی، اسپورٹس و گیمس، فلم، ادب وغیرہ موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں جن کا مطالعہ حیدرآبادیوں کی بہترین دلچسپی ہے۔ ان کتب خانوں اور مطالعہ گھروں سے نہ صرف بچے جوان بلکہ بوڑھے بلا تخصیص مذہب و ملت استفادہ کرتے ہیں۔ عورتوں سے متعلق رسائل اور کتابیں بھی یہاں دستیاب ہوتی ہیں۔ طلباء کی تدریسی و نصابی کتابوں کا بھی بطور خاص اہتمام ہوتا ہے۔ بچوں کے لئے بچوں کے خاص رسالے آتے ہیں۔

حیدرآباد کی سب سے بڑی لائبریری کتب خانہ آصفیہ ہے جہاں مختلف موضوعات کی ہر زبان میں ہزاروں قدیم و جدید کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ ہے۔ یہاں پر ممبرشپ کا طریقہ رائج ہے۔ ہر ممبر 2 کتابیں لے جاکر گھر میں پڑھ سکتا ہے۔ فیس رکنیت لی جاتی ہے۔ ان کتب خانوں میں سے چند دن بھر کے لئے رہتے ہیں بعض شام کے اوقات میں کام کرتے ہیں۔

اسٹیڈیم

حیدرآباد میں 3 بڑے اسٹیڈیم ہیں۔ لال بہادر اسٹیڈیم اور گوشہ محل اسٹیڈیم اور قلی قطب شاہ اسٹیڈیم۔ لال بہادر اسٹیڈیم کا قدیم تاریخی نام "فتح میدان" ہے۔ یہ شہر کے نہایت اعلیٰ ترین اور مصروف حصہ میں واقع ہے۔ اس اسٹیڈیم میں نہایت اہم قومی اور بین الاقوامی ٹورنمنٹ منعقد ہوتے ہیں۔ لال بہادر اسٹیڈیم دو حصوں میں منقسم ہے۔ آؤٹ ڈور اور انڈور جہاں بیسیوں قسم کے اسپورٹس اور گیمس کا انعقاد بآسانی ہوتا ہے اس اسٹیڈیم میں کم از کم 25 ہزار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ نہایت اعلیٰ درجہ کا عصری پویلین بھی موجود ہے۔

گوشہ محل اسٹیڈیم سال بھر مشغول رہتا ہے۔ یہاں پر ہر وقت مختلف قسم کے ٹورنمنٹ ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں پر کسی وقت کرکٹ، بیاڈمنٹن، ٹیبل ٹینس، فٹ بال اور باسکٹ بال کے مشہور ٹورنمنٹ ہوا کرتے تھے۔ چند برسوں سے محض مقامی یا محکمہ جاتی اسپورٹس اور گیمس ہورہے ہیں۔ اس کو پولیس اسٹیڈیم بھی کہا جاتا ہے۔ حیدرآباد میں تیسرا بڑا اسٹیڈیم سٹی کالج کے روبرو قلی قطب شاہ اسٹیڈیم ہے۔ یہاں بھی سال بھر مختلف سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ اسپورٹس کے علاوہ مختلف تہذیبی اور عوامی تقاریب کے لئے اس اسٹیڈیم سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ شہر میں کئی اور چھوٹے اسٹیڈیم قائم ہیں جہاں کھیل کود کی ترقی کے لئے عوام اور حکومت کی جانب سے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

حیدرآباد کے فائر اسٹیشن

حیدرآباد میں فائر سروس کا آغاز 1914ء سے قبل ہو چکا تھا۔ عرصہ دراز تک یہ شعبہ بلدیہ سے متعلق تھا۔ 1937ء میں حیدرآباد کے ایک سینما گھر موتی محل میں آگ لگ گئی تھی جس میں کالج کی لڑکی۔ نامی فلم دکھائی جارہی تھی اس آتشزدگی میں کئی لوگ جھلس کر ہلاک ہو گئے تھے۔ اس واقعہ کے بعد سے فائر بریگیڈ کو بلدیہ کے بجائے سٹی پولیس کے تحت کر دیا گیا۔ 1939ء میں آگ بجھانے کے انجنوں میں اضافہ کیا گیا۔ 1943ء میں اس کی تنظیم جدید ہوئی۔ آج کل حیدرآباد فائر بریگیڈ تمام عصری آلات اور بے شمار افسران و عملہ کے ساتھ ملک کے بہترین فائر بریگیڈز میں شمار ہوتا ہے۔

حیدرآباد فائر بریگیڈ کے تحت حسب ذیل اسٹیشن قائم ہیں۔

گولیگوڑہ، حیات نگر، لنگر حوض، ملک پیٹ، مغلپورہ، چندولال بارہ دری، مولاعلی، مشیرآباد پنجہ گٹہ، صنعت نگر اور سکندرآباد۔

حیدرآباد کے آڈیٹوریم

حیدرآباد میں گذشتہ زمانے میں رقص و سرود کی محفلیں، مشاعرے اور تہذیبی تقاریب کا انعقاد بالعموم دیوڑھیوں کے دیوان خانوں، حویلیوں کے دالانوں یا بارہ دریوں میں ہوا کرتا تھا۔ دور حاضر میں جہاں بہت ساری تبدیلیاں ہوئی ہیں وہیں ایسی محفلوں کے انداز بھی بدلے ہیں اور مقام بھی۔ اب رقص و سرور کی وہ پرانی محفلیں کہاں۔ آج کل ڈانس، ڈرامہ، ممکری، غزل گائیکی، کیبرے اور ڈسکو کا چلن ہے۔ ان کے علاوہ سماجی و تہذیبی پروگرام، مخصوص نوعیت کی ادبی محفلیں، سمینار، سمپوزیم، مشاعرے، وغیرہ آڈیٹوریم میں ہوتے ہیں جہاں پختہ اور مستقل شہ نشین اور حاضرین کی نشست کے لئے ترتیب کے ساتھ کرسیاں جمادی جاتی ہیں۔ روشنی، ہوا اور دیگر ضروریات سے یہ ہال آراستہ ہوتے ہیں۔ بعض آڈیٹوریم اتنے بڑے اور وسیع ہیں کہ بیک وقت 2 ہزار آدمی بھی اکٹھا ہو جائیں تو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ آڈیٹوریموں کے علاوہ شہر کے بیسیوں کمیونٹی ہالوں میں بھی ایسی محفلیں اور جلسے منعقد ہوتے ہیں۔ حیدرآباد کے مشہور ترین آڈیٹوریم یہ ہیں۔

رویندرا بھارتی، ہندی ودیا بھون گاندھی بھون (نامپلی) آندھرا سرسوتی پریشد (بگل کنٹہ اندراپریہ درشنی (باغ عامہ) رویندرا بھارتی (سیف آباد) تیاگ راجہ گنا سبھا (چکڑپلی) اور ریل کلارنگ (بھوئی گوڑہ سکندرآباد) وغیرہ۔

حیدرآباد کی بازی گاہیں

حیدرآباد میں اس وقت جملہ 389 چھوٹے اور بڑے پلے گراؤنڈس یا بازی گاہیں موجود

ہیں۔ (رپورٹ بلدیہ) ان میں چند بے حد بڑے ہیں جہاں پر نہ صرف شہر کے اہم میاچس منعقد ہوتے ہیں بلکہ بین ریاستی اور بین الاقوامی نوعیت کے میاچس ہوا کرتے ہیں۔ اہل حیدرآباد کو ہمیشہ ہی سے کھیل کود سے دلچسپی رہی ہے۔ ہر دور میں مختلف قسم کے کھیل کود کا انعقاد ہوتا رہا ہے۔

حکومت حیدرآباد نے مروجہ جسمانی ورزش اور کھیلوں کو زیادہ مفید بنانے کے لئے پورے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا دوسرا عصری کالج قائم کیا تھا جسے "کالج آف فزیکل ایجوکیشن" سے موسوم کیا گیا تھا اس کالج میں جمنازیم اور میدان کے چھوٹے اور بڑے کھیلوں کی عملی تربیت کے ساتھ ہر کھیل کی نظری تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ (مملکت آصفیہ)۔

اکثر محلہ جات میں گلشن اطفال بنائے گئے تھے جس میں بچوں کے مختلف کھیل کود، ورزش جسمانی کی اشیاء نصب کی گئیں (مرقع عثمانی) حیدرآباد کا سب سے بڑا میدان یا پلے گراؤنڈ، فتح میدان تھا جو آج کل عظیم الشان "لال بہادر اسٹیڈیم" کی صورت میں موجود ہے۔

محکمہ بلدیہ حیدرآباد کی جانب سے شہر کے تقریباً تمام حصوں میں پلے گراؤنڈس قائم ہیں۔

حیدرآباد کی تہذیب

تہذیب و تمدن میں آپسی تعلق کے باوجود یہ دونوں لفظ مفہوم کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ تہذیب فکری و اخلاقی ارتقاء سے عبارت ہے جب کہ تمدن مادی ترقیات، جغرافیائی حالات، سیاسی محرکات، سماجی عوامل اور روایات کی بنیادوں پر تعمیر پاتا ہے۔

اچھے، مفید اور پسندیدہ انسانی اخلاق و آداب، صاف ستھرا کردار، بول چال، سماج کے دیگر عناصر کے ساتھ برتاؤ، عام رویہ میں اعتدال و موزونیت اور افکار و نظریات وغیرہ تہذیب کے دائرہ میں آتے ہیں جن کا یقینی اثر انسان کے ذوق و عمل پر مرتب ہوتا ہے جس سے تمدنی ارتقاء کی راہیں کھلتی ہیں۔ شاید اسی بناء پر تہذیب و تمدن کو ایک دوسرے سے مربوط و متعلق سمجھا جاتا ہے اور تمدنی آثار کو بھی تہذیبی علامات قرار دیا جاتا ہے۔

ایک مخصوص انسانی جماعت یا شہری، سماجی اقدار کے شعور کے ساتھ متحد اور ہم آہنگ زندگی کی تشکیل چاہے تو تہذیب کا صحیح خاکہ ابھرتا ہے۔ اس میں اجتماعی ارادات مثلاً سلطنت، معاشرہ، علوم و فنون کے ساتھ انفرادی اخلاق و آداب، تہذیب کے فکری ارتقاء میں حصہ لیں گے۔ جب ان صفات کے اظہار کے لئے تخلیقی عمل ہوگا تو تہذیب کا مادی پہلو "تمدن" کی صورت میں ابھرے گا۔

حیدرآباد کا معاشرہ اگرچہ کہ مختلف الخیال افراد، متفرق عقائد کے ماننے والوں کا ایک

سیاسی ہی سہی مقصد کی تکمیل اور ایک مخصوص خطہ علاقہ اشہر میں رہنے بسنے کی بناء پر تشکیل پایا ہے تاہم اقدار کے ہم آہنگ شعور نے انھیں ایک تہذیبی وحدت عطا کی۔ اس کے ساتھ سیاسی وحدت نے انھیں "قومیت" کے تصور سے بھی مالا مال کیا۔ اس تہذیبی وحدت یا سیاسی وحدت کے زیر اثر قومیت نے ان کی شناخت حیدرآبادیت کے ساتھ مخصوص کر دی۔ گویا کسی کا حیدرآبادی ہونا ہی "حیدرآبادی تہذیب" کاآئینہ دار سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

حیدرآبادی تہذیب یوں ہی نہیں تشکیل پاگئی بلکہ حیدرآبادیوں کی صدیوں کی شعوری ہم آہنگی، فکری اتحاد اور عملاً ایثار ورواداری کے سبب پروان چڑھی ہے۔ اس کی صورت گری میں جہاں معاشرہ کا حصہ ہے وہیں ریاست کا کردار بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جسے ہم سیاسی وحدت کے اثرات بھی کہہ سکتے ہیں۔

حیدرآباد جہاں مذہب، زبان، رنگ و نسل اور معاشرتی آداب کے لحاظ سے مختلف و متفرق لوگ رہا کرتے تھے، انہیں رشتہ اتحاد میں مربوط کرنے والی طاقت صرف ریاست تھی۔ کیوں کہ ایسے ماحول میں مذہب، عقائد، نظریات یا طرز معاشرت کوئی بھی ایک دوسرے کو جوڑنے کی قوت نہیں رکھتے تھے۔ لہذا اجتماعی زندگی کا اصل مرکز دربار اور بادشاہ بن گیا۔ گویا ایک ریاست کے شہری اور ایک بادشاہ کی رعایا ہونے کا احساس سب سے بڑا موجب ربط و محبت بنا اور یہی معرفت۔ اخوت، احترام، ایثار، کام اور اجرت کی مساویانہ تقسیم، سیاسی وفاداری اور مذہبی رواداری و نیز اقدار کے ادراک کا سب سے موثر وسیلہ ہے۔ اسی ادراک و شعور نے حیدرآبادی تہذیب کی تعمیر و تشکیل کی۔

حیدرآبادی تہذیب کی تشکیل میں جغرافیائی، سیاسی اور معاشی عناصر کا بھی بڑا دخل رہا۔ چارصدی پرانی یہ ہم آہنگ تہذیب، موافق و منفی رجحانات کے درمیان بھی آج پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ گردش ایام اور انقلاب روزگار کے باوجود ہر حیدرآبادی میں اتحاد و رواداری کی یہ شعوری و غیر شعوری امنگ واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ جسے مضبوط بنانا اور مزید آگے بڑھانا وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ نسلیں اپنے تہذیبی ورثہ سے محروم نہ ہوجائیں۔

حیدرآباد کی تہذیب کی سب سے نمایاں علامت دکنی (اردو) زبان ہے جس کو باقی رکھے بغیر اس تہذیب کا تحفظ مشکل ہے۔ حیدرآبادی تہذیب کے بقاء وارتقاء میں یہاں کی مشترکہ تاریخ کا بڑا حصہ رہا ہے۔ مختلف واقعات، حادثات اور تبدیلیوں کا یہاں والوں نے یکساں طور پر سامنا کیا اور سبھی ایک ساتھ متاثر ہوئے۔ سلطنت گولکنڈہ کا خاتمہ، مغل عمل دخل، 1857ء کی جدوجہد آزادی، 1948ء کا پولیس ایکشن اور سقوط حیدرآباد اس کی مثالیں ہیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق، آپسی میل ملاپ، بھائی چارہ، مذہبی رواداری، پیار و محبت، ایثار و اخلاص اور دردمندی سے عبارت یہ تہذیب زبان، ادب، رہن سہن، عادات و اطوار، پسند ناپسند، طرز تعمیر، رسوم و رواج، آداب و اخلاق میں یکساں دکھائی دیتی ہے جو حیدرآباد کے سوا مشکل ہی سے کہیں نظر آئیں گی۔ حیدرآبادی تہذیب پر بادشاہ، دربار، شاہی خاندان، امراء، جاگیردار، خانقاہوں، صوفیاء اور شعراء کا گہرا اثر رہا ہے۔ یہاں کے باشندگان کے افکار و نظریات پر رہن سہن پر لباس پر، مکانات کی بناوٹ پر، تقاریب پر غرض ہر شعبہ زندگی پر ان کے گہرے نقوش نمایاں ثبت ہیں۔ حیدرآبادی تہذیب کے نقوش حیدرآباد کے تمدنی آثار میں نمایاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس تہذیب کی سب سے بڑی خصوصیت کثرت میں وحدت کا حقیقی مظاہرہ ہے۔

تہذیب کا پہلا اثر مادی پہلوؤں پر پڑتا ہے جس کی نمائندگی تمدن کے ذریعہ ہوا کرتی ہے حیدرآبادی تہذیب کا جائزہ اگر " تمدنی۔ علامات سے لیا جانے تو بیان کی ترتیب قائم رہے گی۔

طرز تعمیر

سلطنت گولکنڈہ کے پانچویں تاجدار سلطان محمد قلی قطب شاہ نے جب حیدرآباد کا سنگ بنیاد رکھا تو سب سے پہلے چار مینار کی تعمیر کروائی۔ یہ عمارت مسجد اور تعزیہ کے نمونہ پر بنائی گئی۔ کہا جاتا ہے یہ شہر " مشہد مقدس۔ کے طرز پر تعمیر کیا گیا اور روضہ حضرت امام ضامن علی موسی رضا کے طرز پر چار مینار کی تعمیر کی گئی۔ چار مینار 189 فٹ بلند عمارت ہے اس کے اوپر ایک مسجد ہے۔ مسجد کے ساتھ ایک حوض بنایا گیا تھا جس میں جل پلی کے تالاب سے پانی پہنچایا جاتا تھا۔ اب یہ حوض باقی نہیں اس کے علاوہ نیچے بھی ایک گول حوض بنایا گیا تھا جس میں ایک بہت بڑا فوارہ پتھر میں تعمیر کیا گیا تھا۔ جس میں دو ہاتھی اور دو شرزے (پتھر میں تراشے ہوئے) ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ایک دوسرے پر پانی پھینکتے تھے۔

حیدرآباد کی عمارتیں ۔ تاریخی ارتقاء

قطب شاہی محلات، باغات، مساجد، سرائے، حمام، دواخانے اور حوضوں کی تعمیرات کا سلسلہ تقریباً ایکسو برس تک جاری رہا۔گویا حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب کی تمدنی نشانیاں اپنے بنیادی مراحل ایک صدی تک طے کرتی رہیں۔اورنگ زیب کے حملے اور غلبہ نے چند دہائیوں تک اس سلسلہ کو روک دیا۔خاندان آصف جاہی کے عروج پر دوبارہ تعمیری سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔

نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے دور میں حیدرآباد میں سینکڑوں عمارتیں تعمیر ہوئیں جن میں قابل ذکر پرانی حویلی، رکن الدولہ کا بم، توپ کا سانچہ وغیرہ شامل ہیں۔ شمس الامراء اور ارسطو جاہ نے اپنی دلچسپی سے سینکڑوں تعمیرات کروائیں۔ میر عالم، چندولال، راجہ راؤ رنبھا، رانے رایاں اور راجہ دھرم ونت کے اضافے، حیدرآباد کے تمدنی وقار میں زیادتی کا باعث ہوئے۔ نورالامراء، شمشیر جنگ، امین الملک، خورشید جاہ، آسمان جاہ، وقار الامراء، سالار جنگ وغیرہ نے عالی شان عمارتوں کے ذریعہ حیدرآباد کے تمدن کو استحکام بخشا۔

آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خاں بہادر کا ذوق تعمیر، شاہان مغلیہ کی یاد دلاتا ہے۔ ٹاؤن ہال، عدن باغ، ہائی کورٹ، دواخانہ عثمانیہ، شفاخانہ چارمینار، کتب خانہ آصفیہ، جامعہ عثمانیہ، جوبلی ہال، نمائش گاہ، مسجد باغ عام، مسجد جودی، سٹی کالج کے علاوہ سینکڑوں دیگر عمارتیں اپنے طرز تعمیر کے لحاظ سے بلاشبہ ہمارا مشترکہ تہذیبی ورثہ ہیں۔ان ساری عمارتوں میں ہند و مسلم اور مغربی طرز تعمیر کا امتزاج، حیدرآبادیوں کے خاص طرز فکر کا آئینہ دار ہے۔

حیدرآباد کی دیوڑھیاں

قدیم و جدید عمارتوں، حویلیوں، دیوڑھیوں اور عام مکانات، حیدرآبادیوں کی بلند نظری، حوصلہ مندی، ذوق سلیم اور نفاست پسندی کے ترجمان ہیں۔گذشتہ صدی کی عمارتیں عظمت رفتہ اور ہندو مسلم اتحاد کے گہرے نقوش کو واضح کرتی ہیں۔جدید عمارتیں جو اس صدی کے نصف اول تک تعمیر ہوئیں ان میں بھی ایسی ہی جھلکیاں ملتی ہیں۔ان عمارتوں کا طرز تعمیر بتاتا ہے کہ امراء کے وسیع و عریض محلات، حویلیاں اور دیوڑھیاں ہی دراصل حیدرآبادی تہذیب و شائستگی کے مراکز تھے مسلم روساء، جنگ، دولہ، نوابوں کی طرح ہندو امراء اور جاگیرداروں کی دیوڑھیاں یکساں انداز کی بنائی جاتی تھیں۔پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں ان دیوڑھیوں کا دلچسپ نقشہ کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں

"امراء کے بڑے ایوان اور دیوڑھیاں تہذیب کے مخزن تھے ۔ان میں وسطی زمانے کا رنگ جھلکتا تھا۔دالان اور پیش دالان اور ان کے دونوں طرف وسیع کمرے عمارت کی شان کو دوبالا کرتے تھے اور

ہر بڑی دیوڑھی میں بالاخانہ ضرور ہوتا تھا بالاخانہ دالان کی دونوں طرف اوپر بنایا جاتا تھا اور اس کے دریچے دالان اور پیش دالان میں کھلتے تھے اور بڑے خوشنما معلوم ہوتے تھے۔ دیواروں پر تو سفیدی ہوتی تھی مگر دروازوں اور دریچوں پر رنگ کیا جاتا تھا۔ دروازوں پر بانات کے پردے آویزاں ہوتے تھے۔ دالان کے ساتھ وسیع صحن ہوتے تھے اور دالان کے بالکل سامنے اور صحن کے بیچ میں ایک طویل حوض ہوتا تھا جس میں پانی ہمیشہ بھرا ہوتا اور فوارے چلتے تھے۔ حوض کے دونوں جانب خوشنما درخت اور پھولوں کی کیاریاں ہوتی تھیں اس کے علاوہ بڑے امراء کی دیوڑھیوں کے ساتھ خانہ باغ بھی ہوتا تھا جس میں پھل پھول کے درخت ہوتے تھے۔ ایک گوشہ میں گھوڑوں کا طویلہ ہوتا اور ہاتھی بھی بندھا ہوتا تھا۔ ہاتھی بڑی امارت کی نشانی تھی۔ دالان اور پیش دالان میں سفید چاندنی کا فرش اور چار جامے بچھائے جاتے۔ چھت میں خوشنما لنتر روشنی کے جھاڑ اور رنگ برنگ کی ہانڈیاں ہوتی تھیں۔ نیچے فرش پر مردھنگ رکھے جاتے تھے جس کے اندر ماہی بتیاں روشن کی جاتی تھیں۔۔ (مملکت آصفیہ۔ 334)

حیدرآباد کی دیوڑھیاں کم و بیش اسی وضع قطع کی ہوا کرتیں۔ نوابان اور راجگاں سبھی کے پاس مشترکہ تعمیری ذوق پایا جاتا تھا۔ دیوڑھیوں میں مردانہ اور زنانہ حصے علحدہ ہوا کرتے تھے البتہ وہ ایکدوسرے سے متصل ہوتے۔ مردانہ دیوڑھی میں جو داخلی دروازہ کے قریب واقع ہوتی، ایک علحدہ مہمان خانہ تمام ضروریات سے مزین ہوا کرتا۔ مہمان خانے میں بھی تعمیری تکلفات کا وہی حال نظر آتا تھا۔ دالان پیش دالان ہوتے ان کے دونوں طرف وسیع اور ہوادار کمرے ہوتے۔ سامنے خوبصورت صحن جس میں مختلف النوع پھولوں کے گملے سلیقے سے جما کر رکھے جاتے تھے۔

دیوان خانے

حیدرآباد کی حویلیاں ہوں یا دیوڑھیاں، کوٹھیاں ہوں یا عام مکانات، ان میں دیوان خانہ کا وجود ناگزیر ہوتا۔ یہ دیوان خانے مردانہ حصہ میں تعمیر کئے جاتے۔ دیوان خانہ انسانی تمدن کے ارتقاء کی علامت مانا جاسکتا ہے۔ چوں کہ زمانہ قدیم میں کام کم فرصت وفراغت زیادہ تھی۔ موجودہ دور کی طرح مختلف دلچسپیاں نہ تھیں۔ وقت گذارنا آج کی طرح آسان نہ تھا۔ لوگ اسی غرض کی تکمیل کے لئے اپنے ہم مذاق و ہمنیال دوست احباب کے ساتھ وقت بتانا بہتر سمجھتے تھے چناں چہ ہر محلہ میں دو چار مکانات کے دیوان خانے ہر وقت آباد نظر آتے تھے۔

بظاہر یہ دیوان خانے احباب کی وقت گذاری اور دل بستگی کا وسیلہ نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت یہی حیدرآباد کی مشترکہ زندگی، تہذیب و شائستگی انسان دوستی و رواداری کے مراکز تھے۔ یہاں مذہب، علم، ادب، سیاست، معاشرت اور معیشت کے موضوعات زیر بحث ہوتے۔ یہاں

ہندو مسلمان، سکھ پارسی، عیسائی، بدھی سب مسر ِ بیٹھتے، خوشگوار گفتگو ہوتی، ساتھ کھاتے پیتے، مسائل پر غور و خوص کرتے، وقت ضرورت ایک دوسرے کے کام آتے۔ یہاں کوئی غیریت نہ ہوتی کوئی اجنبیت نہ ہوتی، سب کی فکر، سب کا خیال، سب کا مذاق، سب کی پسند اور سب کا مزاج ایک ہوتا۔ یہیں سے تہذیبی قدریں توانا ہوتیں، یہیں پر شعور ہم آہنگ ہوتا، گویا یہ دیوان خانے تہذیب کے محور اور اس کی ترویج و اشاعت کے بڑے ادارے تھے۔

آداب نشست و برخواست

حیدرآباد کے گھرانوں میں چاہے جاگیردار ہوں یا متوسط طبقہ کے لوگ، علماء و مشائخ ہوں یا عام آدمی۔ مسلمان ہوں یا ہندو، امیر ہو یا غریب، اپنے شائستہ مجلسی آداب کی وجہ سے کسی بھی مقام پر صاف پہچانا جاتا تھا۔ حیدرآباد کے آداب نشست و برخواست پر اسلامی اخلاق، ہندو مت کے سماجی آداب کے مشترکہ اثرات کے ساتھ ساتھ بادشاہ، دربار اور شاہی طور طریق کے واضح نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسلام اگرچہ کہ حریت پسند، مساوات کا علمبردار ہے اور بیجا تعظیم و توقیر کا قائل نہیں لیکن بزرگوں، بڑوں اور لائق احترام ہستیوں کے ادب کی سخت تاکید کرتا ہے۔ والدین، استاد، مرشد، علماء، بڑی عمر والوں اور ہم رتبہ لوگوں کی قدر و منزلت کی تعلیم دیتا ہے۔ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے، حقوق و فرائض کے ضمن میں بنیادی اکائی ہے۔

ہندو مت میں سماجی رتبوں کے لحاظ سے ادب و تعظیم اساسی اہمیت رکھتے ہیں۔ راجہ، بزرگ خاندان، ماں باپ، شوہر، بڑے لوگوں، حاکم، مذہبی پیشوا اور محسن کی تعظیم و تکریم لازمی قرار دی گئی ہے۔ اظہار ادب کے لئے بڑوں کے آگے جھکنا پیروں کو چھونا، نظریں نیچی رکھکر بات کرنا انتہا یہ کہ پیروں پر سر رکھ دینا تک ہندو سماج میں مروج ہے۔

بادشاہ کی حیثیت تمام اقوام عالم میں ہر دور ممتاز مانی جاتی رہی ہے۔ بادشاہ کے مذہب، افکار، اخلاق، پسند ناپسند، نظریات، طرز عمل اور رویے کا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ تمام رعایا پر پڑا کرتا ہے۔ شاہی دربار کے طور طریق اور آداب کے دیرپا اثرات مرتب ہوا کرتے ہیں۔ اسی طرح شاہی خاندانوں کے معاشی اصولوں کو لوگ اپنانا چاہتے ہیں۔

حیدرآباد کے باسی، مذہبی اعتبار سے اسلام اور ہندو مت کے پیرو ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اتنے قریب اور گھلے ملے رہا کرتے تھے کہ ان میں تمیز کرنا مشکل ہوجاتا تھا۔ اس قربت نے مذہبی آداب و اخلاق کو سمجھنے اور انہیں مناسب ڈھنگ سے اپنانے کے مواقع فراہم کئے۔ مسلمہ عقائد، عبادات کے طریقے، مذہبی قوانین و اصول سے قطع نظر دونوں مذاہب کی اخلاقی تعلیمات نے ہندو اور مسلمانوں کو متاثر کیا۔ سیاسی وحدت میں بادشاہ اور دربار کے طور طریق کا عوام

پر گہرا اثر پڑا۔ نتیجتاً حیدرآباد کے تمام طبقات نے نہایت عمدہ آداب معاشرت کو اپنے لئے چن لیا جس کا اثر ان کی روزمرہ نشست و برخواست پر نمایاں ہونے لگا اور آہستہ آہستہ یہ اتنا غالب ہو گیا کہ حیدرآبادی تہذیب کے مظاہر میں آداب نشست و برخواست کو اولین مقام حاصل ہو گیا۔

حیدرآباد میں چاہے ہندو ہو یا مسلمان، امیر ہو یا غریب، ادنی ہو یا اعلی ان عمدہ روایات کا علمبردار نظر آنے لگا۔ بڑوں کا احترام، بزرگوں کا ادب اور ہر تبہ کے ساتھ تواضع ان آداب کا باب اول ہے۔

چھوٹے بڑوں کو بحد عزت دیتے ہیں۔ بڑے چھوٹوں سے ویسی ہی شفقت سے پیش آتے ہیں۔ راستہ میں اگر کوئی بزرگ یا اپنے سے بڑی عمر کا عزیز، رشتہ دار، پڑوسی نظر آجائے تو چھوٹے سلام کر کے رک جاتے، پیش قدمی نہیں کرتے ہیں۔

کوئی کسی کے گھر آجائے اور اگر آنے والا بزرگ ہو تو صاحب خانہ دیگر اہل خاندان کے ساتھ دروازہ سے باہر نکل کر استقبال اور پیشوائی کرتا ہے۔ اسے اپنے ساتھ گھر میں لئے داخل ہوتا ہے۔ گھر آنے والا باہر ٹھہر کر پہلے اپنی آمد کی اطلاع کرواتا ہے۔ جب تک اندر سے کوئی استقبال یا دریافت حال کے لئے نہ آئے سواری سے نہیں اترتا۔ اگر آنے والا ہمرتبہ ہو تب بھی صاحب خانہ خیر مقدم کرتے ہیں۔ مصافحہ معانقہ کے بعد نہایت خلوص و عزت سے دیوان خانہ تک لاتے ہیں۔ آنے والا اگر رشتہ و عمر میں چھوٹا ہو تو صاحب خانہ اپنے بچوں کو ان کی پیشوائی کے لئے بھیجا کرتے ہیں۔ خود منتظر رہتے جب وہ دیوان خانہ یا اندر زنان خانہ میں آجائے تو خود اٹھ کر دو چار قدم آگے بڑھ کر آنے والے کو سلام کا جواب دیتے اور دعاؤں سے نوازتے ہیں۔ مہمان کے حسب رتبہ انہیں شہ نشین یا اپنے بازو لیکر بیٹھتے۔ مزاج پوچھنے کے لئے مخصوص کلمات کہے جاتے۔ مہمان کی خاطر داری اور تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

جب خواتین کسی کے گھر جاتیں تو ان کی بھی ویسی ہی تکریم اور پیشوائی کی جاتی۔ اگر ذاتی سواری میں نہ آئیں تو سواری کا کرایہ صاحب خانہ کی جانب سے دیا جاتا۔ اس میں کسی قسم کی تخصیص نہ تھی۔ بڑے ہوں یا چھوٹے، میزبان کرایہ دیتا۔ کرایہ نہ دینا بد شگونی تھی۔

جب تک مہمان موجود رہے میزبان اپنی ساری مصروفیات کو ترک کر کے مہمان کے ساتھ مصروف تکلم رہتے۔ گفتگو نہایت ملائمت، متانت، دبے لہجہ میں، بحد سنجیدگی اور ٹھہر ٹھہر کر کی جاتی۔ پہلے مخاطب کی پوری بات توجہ اور انہماک سے سنی جاتی پھر اس کا موزوں ڈھنگ سے جواب دیا جاتا۔ گفتگو میں کبھی بھی تلخی آنے نہیں دی جاتی۔ اختلاف رائے کی صورت میں نہایت سلیقہ سے اپنا

زاویہ نظر پیش کیا جاتا۔ چہرے پر کسی قسم کے جذبے کا اظہار ہونے نہیں دیا جاتا۔ بزرگوں، قریبی عزیز یا بے تکلف دوست کو بغیر کھلانے پلانے رخصت نہیں کیا جاتا۔ عام ملاقاتیوں کی میووں، مٹھائی اور مشروبات سے تواضع کی جاتی۔ بوقت واپسی اسی طرح اٹھ کر یا دروازہ تک جاکر خدا حافظ کہا جاتا۔

خواتین اپنے بزرگوں کے سامنے بغیر سر پر اوڑھے نہیں بیٹھتیں۔ ان کی باتیں پوری توجہ اور ادب سے سنتیں۔ ہم رتبہ خواتین سے بھی بڑے اخلاق و تمیز سے گفتگو ہوتی۔ گفتگو کے دوران دوسری طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ کسی ہنسی والی بات پر نہایت آہستگی سے ہنسا کرتیں۔ اونچی آواز سے یا کھلکھلا کر ہنسنا معیوب سمجھا جاتا۔

رواداری

رواداری، حیدرآباد کی تہذیب کا امتیازی نشان رہا ہے۔ اس معاملہ میں خواص و عوام ہندو مسلمان بھی یکساں تھے۔ بادشاہ نے کبھی کوئی بات اپنے اثر و دبدبہ طاقت و قوت کے ذریعہ نہیں چلائی۔ مذہبی معاملات میں حکومت کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں کی جاتی تھی بلکہ معاشرہ کے تمام طبقات کو پوری طرح مذہبی آزادی حاصل تھی۔ چوں کہ بادشاہ اور امراء کا بڑا طبقہ مذہب اسلام کا پیرو تھا اس کے باوجود کبھی ہندو تہواروں، ہندوؤں کے مذہبی امور، پوجا پاٹ، ریت رواج میں خلل اندازی نہیں کی گئی۔ حیدرآباد میں خالص اسلامی دور حکومت میں بھی سینکڑوں کی تعداد میں منادر موجود تھے جن میں چند بڑے اور بے شمار چھوٹے چھوٹے دیول تھے جن کی دیکھ بھال حکومت کی جانب سے کی جاتی تھی۔ کئی منادر کو انعام، جاگیرات، اگرہارا جاری تھے۔ پوجاریوں اور منادر کے خدام کے لئے روزینے مقرر تھے۔ اکثر مندروں کی تعمیر و مرمت حکومت کی نگرانی میں ہوتی تھی۔

آصف جاہی دور سے پہلے قطب شاہی عہد میں بھی حکومت کے اہم انتظامی عہدوں پر ہندو امراء اور راجگاں کا تقرر عمل میں آتا تھا۔ اس سلسلہ میں اکنا مادنا کی مثال کافی ہے۔ دور آصفی میں اعلیٰ ترین عہدہ مدارالمہامی پر راجہ چندولال اور مہاراجہ کشن پرشاد کو فائز کیا جانا، اس بات کی دلیل ہے کہ شاہان حیدرآباد نے مذہب یا عقیدہ کو کبھی بھی مسئلہ نہیں بننے دیا بلکہ صلاحیت، وفاداری، شرافت اور حسن کارکردگی کو اہمیت دی۔ ان اعلیٰ عہدوں کے علاوہ فوج کے مناسب اور شہر کی کوتوالی پر بھی ہندوؤں کا انتخاب متعدد مرتبہ کیا جاتا رہا۔ جو سلاطین حیدرآباد کی بے تعصبی، رواداری اور رعایا پر بھرپور اعتماد کی دلیل ہے۔

مسلمان درویشوں کے پاس ہندوؤں کا عقیدت کے ساتھ حاضری دینا، درگاہوں پر

مسلمانوں کے ساتھ ہندو زائرین کی موجودگی۔ محرم کے موقعہ پر ہندوؤں کا نذرانہ عقیدت، پیران پیر کی نیاز اور جھنڈے کا احترام، علموں کے پاس منت کے لئے حاضر ہونا، فقیری، شربت، کھچڑی پر فاتحہ دلانا، محرم میں سوانگ بھرنا (بہروپ دھارنا) عید برات کے موقع پر مسلمانوں کے ساتھ میل جول اور خوشیوں میں شامل ہونا، اگر ہندوؤں کی رواداری کی علامات ہیں تو دوسری طرف مسلمان عہدہ داروں کا منادر کی تعمیر و مرمت کی ذمہ داری اٹھانا۔ جاترا اور دیگر موقعوں پر منادر کے انتظامات کی نگرانی، دیوالی و دسہرہ کے موقعہ پر ہندو بھائیوں کے ساتھ ان کی خوشیوں میں شامل ہونا، ہندوؤں کے ساتھ ہولی دھلنڈی میں سرگرمی سے حصہ لینا، ہندو امراء و جاگیرداروں کی عزت و احترام کرنا، پوجا پاٹ، تہواروں کے ضمن میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ بننا، شادی و غمی کے موقعوں پر برابر شریک رہنا، مسلمانوں کی رواداری کا کھلا ثبوت ہیں۔

حیدرآباد کی روادارانہ فضاء کی برقراری میں زبان کے اہم کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ کیا مسلمان کیا ہندو سبھی ایک زبان بولا کرتے نہ مسلمانوں کو خالص فارسی پر اصرار نہ ہندوؤں کو سنسکرت یا تلنگی پر ضد۔ مذہبی شعری ادبی اغراض کے لئے چاہے جو زبان اپنے طور پر استعمال کرلیں لیکن عام بول چال، لکھنے پڑھنے، مجلسی ضروریات، شاعری، مکتوب نگاری وغیرہ کے لئے صرف اردو کا استعمال مشترکہ طور پر کیا جاتا تھا جس کے نتیجہ میں ایک خوشگوار ماحول صدیوں قائم رہا۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآبادی اردو پر مقامی اثرات کے نمایاں نشان ملتے ہیں۔

ہندو اور مسلمان کو قریب تر کرنے میں رسوم و رواج کا بنیادی رول رہا ہے۔ مقامی رسومات کو تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ مسلمانوں نے پوری طرح اپنالیا جس سے ایک ایسی یگانگت، ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا ہوگئی جو کبھی اور کسی طریقہ سے ممکن نہ تھی۔ شادی بیاہ، رنج و راحت کے موقعوں پر ہندو مسلم ریت رواج اسقدر مشابہہ ہوتے ہیں کہ فرق و امتیاز مشکل ہوجاتا ہے۔ یہ اہل حیدرآباد کے روادارانہ مزاج کا بہترین ثبوت ہے۔

حیدرآبادی سلام

ہندوستان بھر میں حیدرآبادی سلام اپنی خاص نوعیت کے لحاظ سے بے حد مشہور ہے۔ "سلام" انسان کے معاشرتی شعور، شائستگی اور ربط و تعلق کے اظہار کی علامت ہے۔ مذہب نے بھی "سلام" کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ یہ انسانی تہذیب کے ارتقاء کا نشان بھی مانا جاتا ہے۔ دنیا کے مختلف علاقوں اور قوموں میں سلام کے اپنے اپنے طریقے ہیں۔ ان طریقوں کی مخصوص تاریخ، روایت اور رواج سے یہاں بحث نہیں صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ کسی بھی تہذیب کی انفرادی خصوصیت کی طرح حیدرآبادی تہذیب کی انفرادیت اس کے "طریقہ سلام" کے ساتھ مخصوص ہے۔

حیدرآبادی سلام دراصل ایران اور دہلی کے درباروں کی یادگار ہے۔ قطب شاہی سلاطین پر ایرانی اثرات غالب تھے جب کہ سلاطین آصفیہ بالراست مغلوں کی تہذیب و تمدن کے دکن میں وارث تھے۔

آصف جاہی دربار میں بھی شاہی رواج کے مطابق جب پادشاہ آتے تو نقیب آواز لگاتا "نگاہ روبرو سواری شاہانہ آرہی ہے ، آداب بجالاؤ۔ سارے درباری اٹھ کر کھڑے ہوجاتے جونہی پادشاہ دربار میں داخل ہوتا سب خمیدہ ہوکر ہاتھ کو نیچے اور اوپر لیجاکر 7 ، 9 ، 11 مرتبہ سلام کرتے۔ پادشاہ اپنے سر کے خفیف سے اشارہ کے ذریعہ ان کے سلام کا جواب دیتا۔ جب بھی کوئی تنہائی میں باریاب ہوتا اول و آخر اسی طرح سلام کیا کرتا۔ البتہ 2 ، 2 قدم پیچھے ہٹ کر اتنی ہی مرتبہ سلام بجالاتا۔

امراء اور جاگیرداروں کے پاس بھی سلام کے یہی طور طریق تھے البتہ عام لوگ پادشاہ کو کئے جانے والے آداب کے بجائے ذراسا جھک کر 5 ، 7 بار سلام کیا کرتے تھے۔ ہر مرتبہ لوگ جب ایک دوسرے سے ملتے تو خاص انداز سے خفیف سا خم ہوکر بھرپور انداز سے ہاتھ کو دو تین بار پیشانی تک حرکت دیکر سلام کیا کرتے۔ چھوٹے جب بڑوں کے سامنے آتے تو اسی طرح جس طرح امراء کو سلام کیا جاتا ہے ، جھک کر ایک یا دو بار سلام بجالاتے۔ گھر کے ملازمین ، خدام ، پروردہ ، مالی ، کاماٹی وغیرہ اپنے آقا کو زیادہ جھک کر آداب بجالاتے۔ عام گھروں میں بہوئیں اپنی خوشدامن کو ہر روز سلام کرنے صبح اول وقت پہنچتیں اور سر پر اوڑھ کر ادب سے ہاتھ پیشانی تک اٹھاکر سلام کرتیں جواب میں ساس اپنے دونوں ہاتھ ہتھیلی کی طرف سے کنپٹیوں تک لیجاتی اور انگلیوں کو چٹ چٹاتیں اس کو " بلائیں۔ لینا کہا جاتا ہے۔ بالعموم حیدرآباد کی بڑی بوڑھیاں اپنے خردوں کے سلام کے جواب میں بلائیں ہی لیتیں ہیں۔ سوائے محرم کے چاند کے ہر ماہ نئے چاند کے بعد سارے لوگ اپنے اپنے بزرگوں کو سلام کرتے ہیں۔ چاند کا سلام درباریوں کے لئے لازمی ہوتا۔ اسی طرح رعایا بھی چاند کے سلام کے لئے دربار میں حاضر ہوتی تھی۔ عیدین کے موقع پر بھی چھوٹے بڑوں کو ، ہم چشم آپس میں اپنے اپنے ڈھنگ سے سلام ، مصافحہ اور معانقہ کرتے ہیں

عید و تہوار ، شادی و تقریب کے موقعہ پر ایک اور ڈھنگ سے بزرگوں کی تعظیم کیجاتی ہے یعنی خرد بزرگوں کے قریب آکر سلام کرتے ہوئے اپنی گردن جھکا دیتے اور سر پیٹ سے لگاتے ہیں اسے حیدرآبادی زبان میں " پیٹ میں منڈی ڈالنا۔ کہا جاتا ہے اس موقع پر مرد سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دیتے اور عورتیں بلائیں لیکر دعائیں دیتی ہیں۔

حیدرآباد والے سلام کے الفاظ مختلف ڈھنگ سے ادا کرتے ہیں۔ بالعموم "آداب عرض

ہے۔ کہا جاتا ہے جس کے جواب میں "آداب عرض ہے۔ یا بزرگ اور عمر رسیدہ لوگ - جیتے رہو۔ کہتے ہیں۔ تسلیمات، بندگی، قدم بوسی، سلام عرض کرتا ہوں، کورنش بجالاتا ہوں، تسلیم عرض ہے، یا صرف آداب کہا جاتا ہے جس کا جواب دعائیہ جملوں یا ایسے ہی کلمات سے دیا جاتا ہے۔ السلام علیکم کا جواب وعلیکم السلام دیا جاتا ہے۔

غیر مسلموں کو عموماً آداب عرض ہے کہا جاتا ہے جس کے جواب میں مخاطب ایسے ہی الفاظ کہتا ہے یا پھر نمستے کہا کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے غیر مسلم آپس میں یا مسلمانوں کو بھی اپنے ڈھنگ سے سلام کیا کرتے ہیں۔ نمستے، نمسکار، ڈنڈوت، رام رام، جے رام جی کی وغیرہ کہتے اور ایسا ہی جواب پاتے ہیں جبکہ مسلمان ان کے ایسے سلام کے جواب میں آداب کا لفظ کہتے ہیں۔ سلام کے جواب میں نوازش، کرم، شکریہ، مہربانی، عنایت کے الفاظ بھی کہے جاتے ہیں۔ بعض لوگ بجائے سلام یا آداب کے "مزاج شریف۔ یا" کیسے ہیں آپ۔ کہتے تو جواب دینے والا الحمد اللہ، اللہ کا شکر ہے یا اچھا ہوں کہتا اور شکریہ کے الفاظ ادا کرتا۔

خواتین بالعموم بزرگوں کے " پیٹ میں منڈی ڈالا کرتیں۔ یا پھر سیدھی کھڑی سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کو موڑ کر ہاتھ پیشانی تک لیجاتیں جس کے جواب میں ہم رتبہ خواتین بھی ایسا ہی کرتیں۔ یہ گویا علیک سلیک ہے۔ بعض معمر یا احساس برتری والی خواتین سر کو خفیف سے جھٹکا دیکر جواب کے بار سے سبکدوش ہوجایا کرتیں۔ مرد و خواتین میں بعض لوگ سلام کے خواہشمند بھی رہا کرتے ہیں۔

لباس، تہذیب و ثقافت کی علامت ہے۔ لباس کا معیار، طرز، وضع قطع سے معاشرہ کے رجحانات کو سمجھا جاسکتا ہے۔ لباس کے سلسلہ میں ذاتی پسند سے زیادہ دوسروں کی پسند کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ مثل زبان زد خاص و عام ہے "کھائیے آپ بھاتا، پہنئے جگ بھاتا۔

حیدرآبادی لباس

حیدرآباد کی چار سو سالہ تاریخ میں لباس کو ہمیشہ انفرادی حیثیت حاصل رہی۔ یہاں کی تہذیب کے مختلف خطوط ملبوسات کے ذریعہ ابھرتے اور نمایاں ہوتے ہیں۔ حیدرآباد نے مختلف سلاطین کے ادوار میں تہذیبی و ثقافتی ارتقاء کے مختلف مراحل طے کئے جس کا اثر یہاں کے رہن سہن، بول چال، کھانے پینے اور لباس وغیرہ پر پڑتا رہا۔

ابتداء میں حیدرآباد کے معاشرہ پر قطب شاہی اثرات رہے۔ درمیان کے عبوری دور میں مغل طرز زندگی کو لوگوں نے اپنایا۔ بعد میں آصف جاہی عہد میں قدیم و جدید کا امتزاج نمایاں ہوا۔ عہد حاضر میں ہندوستانی طرز کے ساتھ ساتھ یوروپی اثرات بھی تیزی سے بڑھنے لگے ہیں۔

قطب شاہی سلاطین نے لباس کے سلسلہ میں " دکنی مزاج " کو اپنا کر ایک انقلابی اقدام کیا تھا ۔ حکمرانوں کے اس رویے سے مقامی لوگوں کو اپنی تہذیب کے تحفظ کا شدید احساس ہوا ۔ بادشاہوں کا اثر امراء اور عوام پر گہرائی کے ساتھ مرتب ہوتا ہے ۔ اس سلسلہ میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے اقدامات نے ایک نئی اور صحت مند فضاء تیار کی۔ اس نے اپنے روایتی تاتاری لباس کو ترک کر کے دکنی لباس اختیار کیا۔ وہ پوستین اور باناتی قبا کے عوض ململ کا جامہ اور شبنم کا نیمہ پہنتا تھا ۔ سر پر سمور کی کلاہ کی جگہ دکنی طرز کی پیچ دار پگڑی باندھنے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں جڑاو کے کڑے ہوتے تھے ۔ بادشاہ کا امراء اور عوام پر اثر پڑتا ہے ۔ چنانچہ وہ بھی اسی وضع کا لباس پہننے لگے ۔ عام لوگ بھی ترک و ایرانی لباس کے بجائے مقامی ملبوسات زیب تن کرنے لگے تھے ۔

ململ کا انگرکھا، چوغہ، سر پہ سفید یا رنگین پگڑی اور پیروں میں آبشاہی عام لباس تھی۔ لوگ عموماً مسلح ہوا کرتے ۔ ہتھیار کے بغیر باہر نہیں نکلتے ۔ ہاتھ میں کم از کم لکڑی ضرور ہوتی جس کے فن سے سبھی واقف تھے ۔ امراء دربار میں بغیر دستار و بگلوس نہیں جایا کرتے تھے ۔ مسلمان داڑھی رکھتے جب کہ ہندو داڑھی منڈواتے تھے اور مونچھ رکھتے تھے ۔ بعض لوگوں کی مونچھیں بہت لانبی اور نوکدار ہوا کرتی تھیں۔ کچھ لوگ تنگ آستین کی قبا جس پر بعض دفعہ نیم آستین بھی ہوتی۔ پاجامہ کبھی تنگ کبھی گھیر دار ہوتا، سر پر پگڑی باندھی جاتی۔

مرہٹہ عورتیں ساڑھی باندھتی تھیں اور ساڑھی کے پیچھے کسوٹہ مارتی تھیں۔ تلنگانہ والی عورتیں لہنگا، دامن اور چولی پہنتی تھیں جس سے پیٹ اور پیٹھ نظر آیا کرتی تھی ۔ راجپوت خواتین بھی لہنگے اور دامن استعمال کرتی تھیں۔

حیدرآبادیوں کا کھانا پینا

تاسیس حیدرآباد تک دکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی ارتباط، فکری، معاشرتی اور تہذیبی ہم آہنگی کی ایک منزل سر کر چکا تھا۔ قبل ازیں اگرچہ لباس اور رہن سہن کی طرح ان کے کھانے پینے میں بھی بڑا فرق تھا۔ مقامی ہندوؤں میں اکثر گوشت نہیں کھاتے تھے اور بعض لوگ اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے کہ کبھی کبھار "ماس مچھلی" بھی کھانے میں شامل ہو۔ چند گھروں میں باضابطہ گوشت کھایا جاتا تھا۔ مسلمان جب دکن آئے تو اپنے ساتھ کھانے پینے کا خاص ڈھنگ، پکوان کے طریقے اور مہمان نواز مزاج لیکر آئے۔ کم و بیش تین سو برس کے اختلاط نے اس معاملہ میں بھی دونوں کو بڑی حد تک ہم رنگ کر دیا۔ جب حیدرآباد بسایا گیا تو اس قدر قربت اور یکسانی پیدا ہو گئی کہ تارک لحم خاندانوں کو چھوڑ کر تمیز کرنا مشکل تھا کہ ہندوؤں کا کھانا پینا اور مسلمانوں کا کھانا پینا کیسا ہوتا ہے کیوں کہ دونوں ایک ہی طرح سے اپنے دستر خوان سجایا کرتے تھے

معاشرہ کے مختلف شعبوں کی طرح کھانے پینے پر بھی شاہی محلات اور شاہی دستر خوان کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ حیدرآباد کے عام کھانوں پر شاہی پکوان کے اثرات نمایاں تھے۔ چنانچہ قدیم شعراء اور تذکرہ نویسوں نے بڑی تفصیل سے ان باتوں کا ذکر کیا ہے۔

عشرتی کے فرزند "ہنر نے" نسبہ درپن "میں ایک دعوت کا ذکر کیا ہے۔ ذوقی کے پاس بھی ضیافت نامہ ملتا ہے جس میں اس دور کے کھانوں کی تفصیل موجود ہے۔ "مخزن عشق" کے شاعر وجدی نے بھی ایک سو اشعار میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔

ہندوؤں کے طرز پکوان میں "دکنی" انداز جھلکتا تھا۔ مسلمان اپنے ساتھ ایرانی، ترکی اور ہندوستانی طریقہ لے آئے تھے بعد میں ان سب کے اشتراک و اختلاط سے متعدد نئے نئے کھانے ایجاد ہوئے جنھیں نہ تو پوری طرح مقامی کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی بیرونی بلکہ ان کی نئی شناخت حیدرآبادی کھانوں کے ذریعہ ہونے لگی۔

حیدرآباد والے اچھے کھانوں کے شوقین تھے ان کا معیار بہت بلند تھا۔ کھانے عمدہ لذیذ اور نفیس ہوا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں کیا ہندو کیا مسلمان سبھی برابر تھے۔

بادشاہ، امراء، جاگیردار، متوسط طبقہ اور عام رعایا ہر ایک خاص انداز سے اپنے اپنے دستر خوانوں پر انواع و اقسام کے کھانے چنتے تھے۔ شاہی محلات اور امراء کے پاس ان کے خاص مطبخ ہوا کرتے تھے جہاں ماہرین پکوان جنھیں رکابدار کہا جاتا تھا معقول تنخواہوں پر مامور ہوتے تھے۔ شاہی رکابداروں کی سماج میں بڑی عزت ہوتی تھی۔

شاہی مطبخ محل کے ایک علحدہ حصہ میں بنایا جاتا تھا جہاں سینکڑوں ملازمین رکھے جاتے تھے۔ گذشتہ حیدرآباد کے ایک قطب شاہی مطبخ کا حال بیان کرتے ہوئے سید علی اصغر بلگرامی رقمطراز ہیں۔

"چندن محل میں عام سلحدار باری باری حاضر رہا کرتے تھے۔ گنگن محل میں عرب اور ترک و نیز دکنی سلحدار خاص کی نشست تھی اور صدر صفہ میں صرف معتبر و مقرب ملازمین قدیم حاضر باش تھے۔ صحن محل، اعیان و فضلا کے لئے مخصوص تھا اور مشرقی جانب صفہ طولانی میں صبح و شام دستر خوان چنا جاتا تھا جہاں مطبخ شاہی سے انواع و اقسام کے کھانے روزانہ ہزارہا سادات و علماء و اعیان کو کھلائے جاتے تھے۔ (مآثر دکن)۔

قطب شاہی عہد کی طرح آصف جاہی سلاطین کے دور میں بھی شاہی باورچی خانوں کی رونق کسی طرح کم نہ تھی۔ مطبخ کے نظماء کو خطابات و جاگیرات سے نوازا جاتا تھا۔ شاہی رکابداروں کی تنخواہیں، اعلیٰ ترین عہدہ داروں سے کہیں زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ خصوصی پکوان کے لئے خاص نگران ہوا کرتے تھے۔ سامان مطبخ اعلیٰ معیار کا ہوتا۔ مطبخ میں کئی باورچی، رکاب دار، عام ملازم ہوتے۔

روزانہ مطبخ سے خاصے کے خوان محلات بھیجے جاتے تھے۔ آصفجاہ ثانی کے دور میں ان کی تعداد ایک وقت میں کم از کم 120 خوان ہوتی تھی۔ رجب میں کنڈوں، رمضان میں پیرزادگان، مشائخ، علماء کے لئے خاصہ بھیجا جاتا۔ مسجدوں میں افطاری بھیجی جاتی۔ بارہ وفات اور گیارہویں کے مہینوں میں ہر روز نیاز کا سلسلہ رہتا، ہزاروں غربا و مساکین کو اعلیٰ کھانے کھلائے جاتے۔ محرم کا تمام مہینہ بلاگوشت پکوان ہوتا۔ عاشور خانوں کو دیگیں بھیجی جاتیں۔ غربا کو صبح و شام کھانا کھلایا جاتا تھا۔ "حکومت آندھرا پردیش کے ایک سابق وزیر آنجہانی ایم نرسنگ راؤ صاحب کے احداد قطب شاہی عہد میں شاہی رکابدار کی خدمت پر مامور تھے۔" (دکنی کلچر صفحہ 226) راجہ گردھاری پرشاد آصف جاہ سادس کے عہد میں رکابدار تھے۔

ذوق طعام

حیدرآباد والوں کا ذوق طعام بہت اعلیٰ تھا۔ وہ کھانے پینے کے بے حد شوقین اور باذوق تھے۔ ہوٹلوں کا تو اس دور میں وجود نہ تھا۔ کھلے عام اور بازاروں میں کھانا پینا معیوب خیال کرتے تھے۔ بالعموم گھروں ہی میں عورتیں اعلیٰ قسم کے پکوان کیا کرتی تھیں۔ امراء کے پاس باورچی اور رکابدار مامور تھے۔ جو انواع و اقسام کے کھانے تیار کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ سگھڑ عورتیں بچیوں کو کم عمری ہی میں کھانا پکانا سکھادیتی تھیں۔ حیدرآباد والے "چٹورے" مشہور ہیں ان کے دستر خوان پر ہمہ اقسام کے اچار، چٹنیاں، مربے، تلے ہوئے پاپڑ وغیرہ ضرور ہوا کرتے۔

URDU HA...
HYDER...

ویسے بھی سارے دکن میں کھٹائی کا عام استعمال تھا۔ مگر حیدرآباد کو اس سلسلہ میں فوقیت حاصل تھی اور آج بھی ہے۔ ان کے دستر خوان کھٹے سالن کے بغیر مکمل نہیں سمجھے جاتے ہیں۔ کھٹائی کے ساتھ وہ تیزی کے بھی عادی ہیں یعنی مرچ کا استعمال بھی کثرت سے کیا کرتے ہیں۔

حیدرآباد کے کھانے

دکن کے قدیم کھانے معمولی سی ردوبدل کے بعد حیدرآبادی دستر خوان کی زینت بنتے رہے ہیں۔ ساتھ ہی مسلمانوں کی خاص ڈشس جو ایرانی، ترکی، افغانی، مصری، عربی اور دہلوی طرز کی نمائندگی کرتی ہیں، حیدرآبادیوں کی پسندیدہ بن گئیں۔ اسطرح ایک خاص امتزاج پیدا ہوا جس میں ہرانداز کا کھانا ایک نئے روپ میں نئی لذتوں کے ساتھ حیدرآباد والوں کی پسند اوراعلیٰ ذوق کی علامت بن گیا۔

حیدرآباد کے کھانے خصوصیت کے اعتبار سے ترش و تیز ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی لذت اور چاشنی میں کوئی فرق نہ آسکا بلکہ ایک نیا معیار بن گیا۔ بعض خاص پکوان ایسے بھی ہیں جو برصغیر ہی نہیں دنیا بھر میں کہیں تیار نہیں ہوتے جن میں سے چند یہ ہیں
۔ کھٹی دال، چگر بیگن، بگھارے بیگن، ماہی خلیہ، دوپیازہ، قیمہ میٹھی آلو، مچھلی، چاکنہ، بگھاری کرئی، دہی کی کڑی، خاگینہ، سویے کی بھاجی اور نہاری کلچے۔ ان کے علاوہ آچار و چٹنیاں حیدرآباد میں جس طرح بنتی ہیں شاید ہی کہیں بن سکیں۔ حیدرآباد والے ناشتہ میں میٹھا بہت کم استعمال کرتے ہیں جبکہ شمالی ہند میں صبح ناشتہ میٹھے سے ہی کیا جاتا ہے۔

حیدرآباد میں مختلف علاقوں، مختلف ملکوں، مختلف مزاجوں، مختلف طبائع کے لوگ ایک ساتھ رہتے بستے ہیں۔ یہاں ترکی، افغانی، ایرانی، عربی، مصری، پنجابی، دہلوی، راجستھانی، بہاری، بنگالی مرہٹی، کنڑ، مدراسی، ملیالی غرض ہر قسم کے لوگ اپنی اپنی شناخت کے ساتھ رہتے ہوئے کثرت میں وحدت کا بیمثال نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ایسی صورتحال گذشتہ 4 صدیوں سے برقرار ہے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد اس رنگارنگی میں مزید گہرائی پیدا ہوئی۔

حیدرآباد میں مختلف علاقوں کے رہنے والے اپنے معاشرتی آداب۔ رہن سہن، لباس اور کھانے پینے کے امتیازات کے ساتھ موجود تھے۔ ان کے گھروں میں ان کے خاص پکوان ہوا کرتے بعض اعلیٰ طبقہ کے لوگ اپنے علاقوں کے ماہرین پکوان کو بھی ملازم رکھتے تھے جو انھیں مخصوص علاقائی کھانے پکاکر کھلایا کرتے۔ اگرچیکہ ان سبھوں پر غالب اثر حیدرآبادی کلچر کا رہا تاہم تھوڑی بہت وطنی علامتیں بھی باقی رہیں۔ بالخصوص غذاؤں اور پکوان کے ضمن میں یہ چیز موجود تھی۔

حیدرآباد کے پکوانوں پر ہر دور میں کچھ نہ کچھ اثر پڑا! بعض نئے کھانے ایجاد ہوتے رہے۔

بعض کھانے مفقود ہوئے ۔ بعض پکوان طریقہ تیاری کی تبدیلی کے سبب کچھ کے کچھ ہوگئے ۔ انگریزوں کے حیدرآباد میں عمل دخل کے بعد تو یہ اثر زیادہ تیزی سے مرتب ہونے لگا ۔ پہلی جدوجہد آزادی کے بعد جب ہندوستان سے بہت سارے لوگ حیدرآباد میں پناہ گزین ہوئے اور کئی خاندانوں کو یہاں خصوصیت سے طلب کیا گیا ان کی وجہ سے حیدرآباد کے پکوانوں میں چند اچھے اضافے ہوئے ۔ بعض نامانوس کھانے بھی رائج ہوئے ۔ چند قدیم وجدید پکوان یہ ہیں۔

- قیمہ تارنج ، تاتاری قیمہ ، ہندوستانی تورمہ ، شب دیگ ، دال ماش ، جھینگے ، دوپیازہ کوتمیر ، کھٹہ ، سلطانی دوپیازہ ، ریشمی دوپیازہ ، سلطانی دال ، شاہ چند دال ، ٹٹی کباب ، مطبخ مچھلیاں ، ہمہ اقسام پلاؤ ، بریانی ، نہاری ، مرغ کباب ، طاس کباب ، پسندے کے سیخ کباب ، مرغ کا سالن ، دہی کی کڑی ، پھول کھنار ، مرغ امباڑہ ، سیتھی مرغ ، جہازی تورمہ ، مرغ کا دالچہ ، شکمپور ، کوزی ، ہریس ، مرگ ، حلیم ، دوپیازہ پنیر ، کٹ ، ساگ پالک ، سویا میتھی ، سویا کلیجی ، طوتک ، لقمی ، پسندے ، کڑھائی کے پسندے ، یخنی پلاؤ ، حیدرآبادی چاکنہ ایک خاص ذائقہ رکھتا ہے ۔ اس طرح کا چاکنہ پورے ہندوستان میں کہیں نہیں بنتا۔

حیدرآبادی میٹھے بھی اپنی غیر معمولی ترکیب ، تیاری ، لذت اور نفاست کی وجہ سے منفرد ہیں ۔ پورے ہندوستان میں جو میٹھے مقبول ہیں ان میں سے اکثر یہاں بھی بنتے ہیں لیکن چند خاص طرز کے میٹھے سوائے حیدرآباد کے کہیں نہیں بنتے ۔ مثلاً پورن پوری ، پوری ، حلوہ سوہن ، محبوبیاں ، گل فردوس ، خواجہ پوری ، پھولوں کا میٹھا اور گلقند وغیرہ ۔ ان میں پورن پوری کو منفرد حیثیت حاصل ہے ۔ حیدرآباد کی پورن پوریاں اپنی لذت کے اعتبار سے بھی یکتا ہیں ۔ اس کے متعلق ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اصلی پورن پوری تو حیدرآباد میں، جیسے شاہی رکابدار ہی بناتا ہے ۔ رنگ مائل بہ سرخ ، تقریباً پون انچ موٹی ، مانڈھے نہایت پتلے ، تخمیناً دس گیارہ تہہ بہ تہہ ، ملائم اس قدر کہ ہر پرت بلانوئے بآسانی نکل آنے اور لپٹیں تو لپٹتی جانے (خستگی کو اس سے کوئی تعلق نہیں) پورن کا پکانا ، میدہ کا گوندھنا ، مانڈے کا بیلنا پھر سینکنا ان تمام خصوصیات کا تناسب شاہی رکابدار کی پورن پوری میں اس قدر تناسب اور اتم درجہ کا ہے کہ یہ اسی کا حصہ ہو چکی ہے ۔ ۔ (مملکت آصفیہ ۔ صفحہ 378)۔

میٹھوں میں قلاقند بالائی ، سیویاں ، شاہی ٹکڑے ، کھیر ، شیرنی ، زردہ ، انڈے کا حلوہ ، گاجر کا حلوہ ، رشتہ بادام کا حلوہ ، یاقوتی ، حب کے لوز ، روٹ حلوہ ، دہی کے لوز ، حب کے جونگے ، پھولوں کا خشکہ اور میٹھا ، جوزی حلوہ سوہن وغیرہ خاص انداز سے تیار کئے جاتے ہیں اور خوب مقبول ہیں۔

حیدرآباد کے بعض گھرانوں کے بعض مخصوص پکوان بیحد شہرت رکھتے تھے ۔

انگریزوں کے حیدرآباد میں داخلہ کے بعد سے یعنی نواب سکندر جاہ بہادر کے عہد سے یہاں انگریزی طرز کے کھانے جاری ہوئے۔ ابتداً فوجی چھاؤنی کی حد تک ان کا رواج رہا بعد میں آہستہ آہستہ امراء اور جاگیرداروں کے پاس بھی انگریزی کھانے پسند کئے جانے لگے۔ پچاس ساٹھ برس بعد اعلیٰ طبقہ میں انگریزی غذاؤں کا عام چلن ہوگیا۔ ان کے گھروں میں انگریزی طرز کا پکوان جاننے والے باورچی خصوصیت سے رکھے جانے لگے۔ دعوتوں میں مغلئی اور حیدرآبادی کھانوں کے ساتھ انگریزی ڈشس لازمی طور پر ہوا کرتی تھیں۔

حیدرآباد والوں کی سواریاں

گذشتہ دور میں حیدرآباد سے باہر بہت کم سفر کیا جاتا تھا۔ سواریوں اور شاہراؤں کی عدم سہولت کے سبب دور دراز جانے کے لئے لوگ بہت کم آمادہ ہوتے تھے۔ شہر میں بھی باوجود پختہ سڑکیں ہونے کے بہت کم سواریاں تھیں۔ اس زمانے میں بھی آج کی طرح دو طرح کی سواریاں ہوا کرتی تھیں۔ یعنی عام سواریاں اور خاص سواریاں۔ لوگ زیادہ تر پیدل پھرا کرتے تھے۔ صرف ناگزیر حالات میں یا زنانہ کے لئے سواریوں کا استعمال ہوتا تھا۔

ہاتھی

امراء اور روساء کے پاس ہاتھی جھولتے تھے۔ جاگیرداروں، نوابوں، منصبداروں، راجاؤں، مہاراجاؤں کے پاس ان کے ذاتی ہاتھی ہوا کرتے تھے جس کے دولت خانہ میں ہاتھی ہو وہ بڑے رئیسوں میں گنا جاتا تھا۔ امراء ان ہاتھیوں پر سواری کیا کرتے تھے جن پر بادشاہ مہربان ہوتا، انہیں ہاتھی کے ساتھ عماری اور جھالر کے استعمال کی اجازت دیتا۔ یہ گویا ایک بڑا اعزاز خیال کیا جاتا تھا۔ حیدرآباد میں ایسے پچیس تیس عماری نشین امراء و جاگیردار تھے۔ یہ امراء خاص مواقع پر اپنے ہاتھی اور عماری، علم، نشان کے ساتھ شاہی جلوسوں میں نکلا کرتے تھے۔ جلوسوں میں ہاتھی پر نوبت بٹھائی جاتی تھی۔ طوائفیں بھی سوار ہوتی تھیں۔

اونٹ

اونٹ بھی اہل حیدرآباد کی سواری کی ضرورت میں کام آتا تھا چونکہ سانڈنی بہت تیز رفتار ہوتی اس لئے دور دراز کے سفر سانڈنی پر کئے جاتے تھے۔ رمضان کے چاند اور عید کے چاند کی اطلاع بیدر سے حیدرآباد سانڈنی سوار کے ذریعہ پہنچتی تھی۔ حمل و نقل اور باربرداری کے لئے اونٹ ایک بہترین ذریعہ تھا۔

گھوڑا

گھوڑے کی سواری ہی شہ سواری کہلاتی ہے۔ گھوڑا ساری دنیا میں سفر کی غرض ہی نہیں بلکہ جنگ و امن کے دوران متعدد مقاصد کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ گھوڑے کی پیٹھ پر خوگیر باندھی جاتی جو روئی دار کپڑے اور بانات سے بنتی تھی۔ بعد میں گھوڑوں پر زین کسی جانے لگی۔

بیل گاڑی یا بیل بنڈی

بیل اور بیل گاڑی صرف قصباتی آمدورفت کے ہی وسیلے نہیں ہیں بلکہ شہری زندگی میں بھی ان سے بے پناہ کام لیا جاتا ہے اور یہ شہریوں کے لئے بھی اتنے ہی ضروری ہیں جتنے کسی کھیت یا دیہات کے لئے۔ باربرداری اور آمدورفت کے مقاصد کی تو بآسانی تکمیل ان کے ذریعہ کی جاسکتی ہے حیدرآباد کے بعض لوگ بیل کو بھی گھوڑے کی طرح استعمال کرتے تھے۔ بیل گاڑی میں دس بارہ آدمی آرام سے بیٹھ جاسکتے ہیں۔ میلوں اور تہواروں کے موقع پر بیلوں کو خوب سجا بنا کر مقابلہ کے لئے لیجایا جاتا تھا۔ بیلوں کو خوب کھلا پلا کر تروتازہ رکھا جاتا تاکہ کام میں سستی نہ آنے پانے اور مقابلہ کے وقت بھی تازہ دم رہ سکیں۔ بیل گاڑی جس میں سواری کی جاتی ہے اس میں بالعموم دو بیلوں کی صحت مند جوڑی یا تین بیل باندھے جاتے ہیں۔

رتھ

حیدرآباد میں قدیم عہد میں رتھ کا بھی رواج تھا۔ بادشاہ اور امراء کے محلات میں رتھ ہوا کرتے تھے۔ رتھ دراصل ایک خوشنما اور آرام دہ بیل گاڑی ہے جس میں بیل کے بجائے گھوڑے باندھے جاتے تھے۔ سلاطین آصفجاہی کے پاس انگریزی طرز کی بگھیوں کا عرصہ دراز تک چلن رہا جس کی سجاوٹ خالص مشرقی طرز پر ہوا کرتی تھی۔

پالکی

پالکی کا استعمال حیدرآباد کی دیوڑھیوں میں بہت عام تھا۔ اعلیٰ طبقہ اور اوسط درجے کے جاگیرداروں کے گھروں میں آرام دہ پالکیاں تھیں جن میں سفر کرنا وہ اپنے شایان شان خیال کرتے تھے۔

پالکی ایک بڑا صندوق نما سا ڈبہ معلوم ہوتی جس کے آگے پیچھے دو دو بانس نکلے ہوتے جنہیں کہار یا پالکی بردار اپنے شانوں پر اٹھا کر چلا کرتے۔ پالکیاں کئی طرح کی ہوا کرتی تھیں سادہ بھی اور عمدہ کاریگری سے مزین بھی۔ یہ چھوٹی بھی ہوتیں اور بڑی بھی۔ بڑی پالکیوں میں بیک وقت چار آدمی آمنے سامنے بیٹھ سکتے تھے۔ امراء کی پالکیاں خوب بجی سجائی ہوتیں۔ خواتین کے لئے پالکی پر پردے گرا دینے جاتے تھے۔ سوار ہونے کے وقت پالکی بردار منہ پھیر لیا کرتے تھے۔ پالکی بردار

بالعموم قابل بھروسہ آدمی ہوا کرتے اسی وجہ سے خواتین اکیلی سوار ہو کر جہاں چاہیں جایا کرتی تھیں

چھوٹی پالکی جس میں صرف خواتین بیٹھا کرتیں ایک یا دو عورتوں سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہوا کرتی اس کو پالکی کے بجائے ڈولی کہا جاتا تھا۔ ڈولی کو پالکی کے برعکس صرف ایک ایک بانس آگے پیچھے ہوا کرتا ہے۔

میانہ

ڈولی کو حیدرآباد میں میانہ بھی کہا جاتا تھا۔ اس کا حیدرآباد میں خوب رواج تھا۔ حیدرآباد کی معزز خواتین ان میانوں میں نکلنا اپنی شان کے موافق خیال کرتی تھیں۔

انگریزی بگھیاں جو نواب آصف جاہ ثانی کے دور سے سلاطین آصفیہ کی خدمت میں انگریز پیش کیا کرتے تھے ان کے مختلف نام ہوا کرتے تھے جن میں سے چند یہ ہیں۔ لینڈو، ھاف لینڈو، پالکن، بروھام، فٹن، ڈاک کارٹ وغیرہ۔ ان گاڑیوں کو دو، دو، چار، چار یا ایک ایک گھوڑا باندھا جاتا تھا۔ امراء کے پاس بھی ایسی گاڑیاں رہا کرتی تھیں۔

عرب جمعدار نواب غالب جنگ کے پاس چاندی منڈھی ہوئی گاڑی موجود تھی لینڈو گاڑی کو چمڑے کا ناپ ہوا کرتا تھا۔ پالکن اور بروھام گاڑی کا ناپ بھی چٹ لکڑی کا ہوتا تھا جو کھل نہیں سکتا تھا۔ فٹن کا چمڑے کا ناپ ایک ہی طرف اترتا تھا۔ ڈاک کارٹ کی مختلف صورتیں ہوتی تھیں۔

ٹانگہ

ٹانگہ گاڑی حیدرآباد کی مقبول ترین سواری تھی۔ بعض ایک اور بعض دو گھوڑوں کے ٹانگے ہوا کرتے تھے۔

حیدرآباد میں ٹانگوں کا استعمال بڑے عہدہ دار اور ملازمین زیادہ کیا کرتے تھے۔ عوام بالعموم شکرام میں نکلتے تھے۔ شکرام ایک خاص طرز کی لانبی گاڑی ہوتی تھی جس پر پردہ رہتا تھا اور 2 بیل باندھے جاتے تھے۔

شکرام

کھاچر اور رتھ کے بجائے شکرام عوام پسند سواری تھی۔ اکثر لوگ ٹانگے اور شکرام ذاتی رکھتے تھے۔ ان تمام سواریوں کے ساتھ ایک سواری اور بھی عام تھی اس کو جھٹکہ کہا جاتا تھا۔

جھٹکہ

جھٹکہ میں جملہ پانچ آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ اس کو ایک گھوڑا باندھا جاتا تھا۔ یہ شمالی ہند کے یکہ کی طرح ہوتا تھا۔ حیدرآباد میں سینکڑوں جھٹکے تھے۔ عورتوں کے لئے پردہ باندھ دیا جاتا تھا۔

حیدرآباد کے تمام اعلیٰ وادنی طبقات میں سواریوں کا عام رواج تھا۔ امراء کے ہاں ان کے معیار و مزاج کے مطابق سواریاں تھیں۔ متوسط اور غریب طبقہ کے پاس ذاتی سواری نہ بھی ہو تو موقتی طور پر کرایہ کی سواریاں بہ آسانی مل جایا کرتی تھیں۔ شہر میں جھٹکے کثرت سے تھے بعد میں سیکل رکشا کا چلن عام ہوا۔

سیکل

سیکل پوری دنیا میں آرام دہ، ارزاں، سہولت بخش اور ہلکی پھلکی سواری کے طور پر بے حد پسند کی جاتی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اس کا چلن ابتداً بہت رہا بعد میں اس کی مقبولیت ترقی پذیر ملکوں میں بڑھ گئی۔ شہر حیدرآباد میں بھی سائیکلوں کا رواج یکایک عام ہوا اور اس سواری کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ کہا جاتا ہے حیدرآباد سائیکلوں کا رواج 1895 ء کے بعد ہوا۔ سب سے پہلے نواب فخرالملک نے اپنی ذاتی سواری کے لئے حیدرآباد میں سیکل لاکر استعمال کی۔ یہ سائیکل عجیب وضع کی تھی۔ اگلا پہیہ بڑا اور پچھلا چھوٹا۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ پورے ہندوستان میں پونا کے بعد حیدرآباد میں سب سے زیادہ سائیکلیں چلا کرتی تھیں۔

موٹر کار

حیدرآباد والے 1905 ء سے پہلے موٹر کار سے واقف نہ تھے۔ پہلی مرتبہ کنگ جارج پنجم کے دورہ حیدرآباد کے موقع پر ان کی سواری کے لئے موٹر کار حیدرآباد لائی گئی تھی۔ اس کے دوسرے سال راجہ صاحب ونپرتی نے موٹر کار خریدی۔ آہستہ آہستہ موٹروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ 1914 ء تک تقریباً ہر امیر اور جاگیردار کے پاس اس کی ذاتی موٹر کار موجود تھی۔ امراء اپنی موٹروں کے ساتھ حفاظتی دستہ رکھتے تھے۔ جب بھی کوئی موٹر گذرتی تو پولیس سیٹی بجاتی۔ کوتوال شہر کی موٹر کے لئے دو، وزراء کی موٹروں کے لئے تین اور بادشاہ کی گاڑی کے لئے چار سیٹیاں بجائی جاتی تھیں۔

ریلوے

حیدرآباد میں پہلی مرتبہ 1874 ء میں ریلوے کا آغاز ہوا۔ اگرچہ کہ 8 سال پیشتر ہی ریاست کے حدود میں ریلوے لائن بچھائی جاچکی تھی مگر شہر سے وقارآباد تک پہلی ریل گاڑی نواب سرسالار جنگ اول کے عہد میں شروع ہوئی۔ بعد میں تدریجی طور پر اضافہ ہوا۔ سقوط حیدرآباد

تک پورے ملک سے ریلوے کے ذریعہ حیدرآباد کا رابطہ قائم ہو چکا تھا۔ آج ریلوے آمد و رفت کا ایک سریع اور موثر وسیلہ ہے۔ حیدرآباد میں 3 ریلوے اسٹیشن مرکزی حیثیت کے حامل ہیں ان میں سکندرآباد جنوبی ریلوے کا بڑا جنکشن ہے جبکہ نامپلی اور کاچیگوڑہ کے اسٹیشن بڑی لائن اور چھوٹی لائن کی گاڑیوں کے اہم مراکز ہیں۔ محکمہ ریلوے ابتداً انگریز کمپنی کے تحت تھا بعد میں نظام س گیر نٹیڈ اسٹیٹ ریلوے کمپنی سے حکومت آصفیہ نے ریلوے کو خرید لیا۔ اب انڈین ریلوے پورے ملک کے ریلوے نظام کو چلاتی ہے۔

بس سرویس

حیدرآباد میں حمل و نقل کے لئے ریلوے کی وجہ سے بڑی سہولت ہوئی۔ بعد ازاں سڑکوں کے ذریعہ اس کو مزید توسیع دی گئی۔ اس سلسلہ میں حیدرآباد اور سکندرآباد کے درمیان بس سرویس کا تجرباتی آغاز کیا گیا۔ جون 1932ء میں 27 بسوں کے ذریعہ اس کام کا آغاز کیا گیا۔ یہ بسیں چارمینار سے سکندرآباد اسٹیشن براہ مشیرآباد چلا کرتی تھیں۔ ہر بس میں 19 سیٹ ہوتے تھے۔ عورتوں کی 4 نشستیں آگے مختص ہوتیں اور درمیان میں پردہ ڈالا جاتا تھا۔

ہوائی جہاز

حیدرآباد میں ہوابازی کا محکمہ 1938ء میں قائم ہوا۔ یہ ریلوے کے زیر انتظام تھا۔ سفر اور حمل و نقل میں تیز رفتار ترقی کا سہرا دکن ایرویز کے سر ہے جو ہوابازی کے محکمہ کے تحت کام کر رہا تھا۔ دکن ایرویز کے طیارے پورے ملک سے حیدرآباد کو جوڑتے تھے۔ آج حیدرآباد کا فضائی رابطہ پوری دنیا سے قائم ہے۔ بیگم پیٹ ایرپورٹ انٹرنیشنل موقف اختیار کر چکا ہے۔

موٹر سیکل

حیدرآباد کی سواریوں کا ذکر اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک موٹر سائیکل اور آٹورکشاؤں کا ذکر نہ کیا جائے۔ حیدرآباد میں موٹر سائیکلوں کا چلن گذشتہ 60، 70 سال سے ہے۔ موٹر سائیکل ایک نہایت تیز رفتار، آرام دہ اور سستی سواری ہے۔ حیدرآباد میں موٹر سائیکلوں کی تعداد آج کل کسی طرح ایک ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں ہے۔ ملک بھر میں شاید حیدرآباد کا پانچواں مقام ہے جہاں اس قدر کثیر تعداد میں موٹر سائیکلیں ملتی ہیں۔ بیسیوں کمپنیوں کے بیشمار ماڈلوں میں دستیاب یہ موٹر سائیکلیں حیدرآباد کی سڑکوں پر دندناتی پھرتی ہیں۔ مردوں کے علاوہ بعض عورتیں بھی موٹر سائیکل چلاتی ہیں۔

آٹو رکشا

گذشتہ دنوں حیدرآباد میں آٹو رکشا سے کوئی واقف نہ تھا۔ 1965ء میں شاید دوچار آٹو ہی شہر میں نظر آتے تھے۔ لیکن 1970ء کے بعد سے ان کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور آج کم از کم 20 ہزار آٹو رکشا شہر میں موجود ہیں اور لگ بھگ ایک لاکھ افراد اس سروس سے وابستہ ہیں۔ آٹو سہولت بخش اور سستی سواری ہے۔

ٹیکسی کار

حیدرآباد میں ٹیکسی کاروں کی اجارہ داری شروع میں "دی دکن موٹر سرویسز اور خان بہادر قادر نواز اور کاظم یار جنگ" کے پاس رہی۔ اس وقت ٹیکسی کے اتنے زیادہ کرائے وصول کئے جاتے تھے کہ عام آدمی کی برداشت سے باہر تھا۔

رکشا

حیدرآباد میں سیکل رکشا 1903ء میں شروع ہوا۔ اس کو دو آدمی کھینچتے تھے۔ جب 1908ء میں موسی ندی میں طغیانی آئی تھی اسی دوران آصف جاہ سادس کے پیروں میں سخت درد تھا وہ حرکت نہیں کرسکتے تھے۔ چلنے پھرنے میں بےحد تکلیف تھی۔ حضور نظام کے حکم پر سیمپسن اینڈ کمپنی مدراس نے ایک خاص قسم کا رکشا تیار کیا تھا جسے دو آدمی چلاتے تھے۔ ایک آگے اور ایک پیچھے۔ یہ لکڑی سے بنایا گیا تھا اگلے حصہ میں ایک دروازہ بھی تھا۔

آہستہ آہستہ رکشاؤں کی ہیئت میں تبدیلی آنے لگی۔ آج کل نہایت ہی مختصر آرام دہ اور ایک آدمی کے کھینچنے کے لائق رکشے حیدرآباد کی سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔ حال حال تک رکشاؤں پر زنانہ کے لئے پردہ ہوا کرتا تھا۔ اب یہ رواج باقی نہیں۔ حیدرآباد میں ہزاروں رکشا ہیں جو اسی تناسب سے ہزاروں خاندانوں کا ذریعہ معاش بنے ہوئے ہیں۔

حیدرآباد اور فنون لطیفہ

فن اور زندگی کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ فن زندگی کے تجربات کا شاہد، واضح اور شارح ہے۔ تخلیق فن کا مقصد مسرت روح ہی نہیں بلکہ ضروریات کی تکمیل بھی ہوتا ہے اس لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک کارآمد فن اور دوسری فن لطیف۔ یہاں دوسری قسم سے اہل حیدرآباد کی دلچسپی موضوع بحث ہے۔

فنون لطیفہ تخلیق کار اور سامع و ناظر دونوں کو ایسی روحانی مسرت بہم پہنچاتے ہیں جن کا الفاظ میں اظہار مشکل ہے۔ فنون لطیفہ قوموں کے ذہنی معیار کے غماز ہوتے ہیں جو تہذیبی ترقی اور عقلی برتری کا وسیلہ اظہار بھی ہیں۔ حیدرآباد کے باسیوں کی فنون لطیفہ میں ترقیات ان کی مادی

خوشحالی کے سبب مانی جاسکتی ہے۔

فنون لطیفہ میں فن تعمیر، موسیقی، مصوری، خطابت، شاعری، مجسمہ سازی ہی نہیں بلکہ خوش نویسی، خطاطی، کتابت، جلد سازی وغیرہ بھی شامل کئے جاسکتے ہیں۔ ان تمام شعبوں میں اہل حیدرآباد کا دخل، دلچسپی اور کمال قابل تحسین ہے۔ ان فنون میں بعض کا تعلق دیکھنے سے، کچھ کا سننے سے اور چند کا تعلق احساس کے ساتھ ہے۔

حیدرآباد کے باسیوں کو فنون لطیفہ کا ورثہ بہمنی سلاطین اور بادشاہان گولکنڈہ کے درباروں سے ملا جہاں دنیا بھر کے چنندہ اور منتخب روزگار اہل علم و فن جمع تھے۔ انھوں نے فنون لطیفہ کے مختلف شعبوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ ہماری تاریخ کا ایک گراں قدر اثاثہ ہیں۔

فنون لطیفہ کی تاریخ یقیناً بڑی پرانی ہے۔ دماغ ہندی کی ماضی میں جو شہرت تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ ہندوستانیوں نے علوم و فنون کی ترقیات میں جو حصہ ادا کیا ہے اس کا اعتراف آج پوری دنیا کرتی ہے۔ دکن میں زمانہ قدیم ہی سے مجسمہ سازی، مصوری، تعمیرات اور موسیقی کے چرچے تھے۔ عہد وسطی میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے ان فنون کی ترقی کے نئے امکانات پیدا ہونے کیوں کہ مسلمانوں کو بھی ان فنون سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ بہمنی تاجدار محمد شاہ کو موسیقی سے اس قدر لگاؤ تھا کہ اس نے دہلی سے تین سو موسیقاروں کو گلبرگہ بلوایا تھا۔ بہمنی سلطنت کی جانشین دکنی سلطنتوں کے تمام فرمانرواؤں کو بھی مختلف فنون لطیفہ سے بے حد تعلق خاطر رہا۔

فن تعمیر

فن تعمیر سے حیدرآباد والوں کی دلچسپی کا حال یہاں کی قدیم اور عظیم عمارتیں بیان کرتی ہیں جو ان کے ذوق تعمیر، بلند معیار، حسن تخیل اور نفاست پسند مزاج کی آئینہ دار ہیں۔ فنی اعتبار سے ان عمارتوں میں جو کمال نظر آتا ہے وہ کسی اور مقام کے آثار و عمارات میں کم کم ہی دکھائی دے گا۔ فن تعمیر میں حیدرآباد والے بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ ان کے فنی کمالات کے نمونے پورے شہر میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حیدرآباد کی عمارتوں میں دکنی طرز تعمیر اور اسلامی جھلکیاں بڑا خوبصورت امتزاج پیش کرتی ہیں۔ فنکاروں نے نہایت چابکدستی سے ان عمارتوں میں ہندو مسلم طرز فکر کی عکاسی کر کے اپنے فنی کمال کا لوہا منوالیا ہے۔ علاوہ ازیں جو عمارت بنائی گئی اس کی غرض و غایت اور مقصد تعمیر کو بہت عمدگی کے ساتھ اس میں اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ بادی النظر میں اسکی شناخت کرلی جاسکتی ہے۔ حیدرآباد کی تعمیرات میں دکنی، ہندوستانی، ترک، ایرانی اور عربی طرز کا امتزاج نمایاں نظر آتا ہے۔

1590ء میں تاسیس شہر کے وقت جو نقشہ امیر شہر کے سامنے تھا اس میں ان تمام

باتوں کا خیال رکھا گیا تھا جو مختلف عقائد، مذہب اور نظریات کے ماننے والوں کے افکار اور پسند و ناپسند سے متعلق تھیں۔ شہر اس خوبی کے ساتھ تعمیر کیا گیا کہ کسی کو بھی اس میں اجنبیت کا احساس نہ رہے۔ ساتھ ہی فن تعمیر کی تمام خوبیوں کا اظہار بھی بھرپور انداز سے ہو۔ حیدرآباد کے معماروں کی فن تعمیر میں کمال اور دسترس کا حال ان عمارتوں کے طرز تعمیر سے کیا جاسکتا ہے۔

چارمینار، مکہ مسجد، دارالشفاء، ٹولی مسجد، مسجد میاں مشک، بادشاہی عاشورخانہ، شاہی محلات، گلزار حوض، شہر کی کمانیں، دریچے، منادر، معبد، فصیل، شاہراہیں، دوکانات، مکانات، باؤلیاں، مقبرے، گنبدیں وغیرہ۔ ان ساری عمارتوں میں اگرچہ کہ اینٹ، پتھر، چونا، لکڑی، لوہا وغیرہ استعمال ہوا ہے لیکن جس ڈھنگ سے ان کا ڈھانچہ تیار کیا گیا اور جس طور پر ان عمارتوں کو تعمیری حسن سے مزین کیا گیا وہ حیدرآباد والوں کے فن تعمیر میں درک اور کمال کو ظاہر کرتا ہے۔ لوگ بالعموم ان عمارتوں کے مادی اور خارجی چیزوں پر ہی غور کرتے ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ان عمارتوں کے ذہنی پس منظر کی طرف توجہ کی جائے جو ان تعمیرات کی اصل خصوصیت ہے اور جہاں ان عمارتوں کے خالق کی شخصیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔

موسیقی

موسیقی دراصل آوازوں کا وہ منضبط سلسلہ ہے جن کے ذریعہ موسیقار اپنے جذب و احساس کا اظہار کرتا ہے جنھیں ایک آہنگ دینے کے لئے ساز کی مدد لی جاتی ہے۔ حیدرآباد کا موسیقار یقیناً اس فن کے ان تمام پہلوؤں پر گہری نظر رکھتا ہے اور اظہار فن کے معاملہ میں کسی بھی جگہ کے فنکار سے ہرگز پیچھے نہیں۔

دکنی سلاطین کو ہر دور میں موسیقی سے خاص لگاؤ رہا ہے۔ ان کے درباروں میں ملک بھر کے بلند پایہ موسیقار جمع تھے۔ ان کی قدر افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ بیجاپور کے دربار سے چار ہزار موسیقار وابستہ تھے۔ خود ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی میں وہ کمال تھا کہ اس کو موسیقی کے موجد لفیثاغورث کا ثانی اور جگت گرو کہا جاتا تھا۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کے قریبی روابط اور دونوں ملکوں کے عوام کی قربت کے سبب قطب شاہی دربار میں بھی باکمالوں کا مجمع سا رہتا تھا۔

حیدرآباد میں فن موسیقی کی سرپرستی خود بادشاہ کیا کرتا تھا۔ سلاطین گولکنڈہ کی طرح آصف جاہی تاجداروں نے بھی اس فن اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی میں بھرپور دلچسپی لی۔ مہ لقا بائی چندا، آصف جاہ ثانی نواب نظام علی خاں بہادر کے دور کی ایک باکمال موسیقارہ تھی جس کے فن کی پورے ہندوستان میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ چندا نے موسیقی کے فن کو حیدرآباد میں اعتبار بخشا۔ چندا بیک وقت موسیقارہ، شاعرہ، طوائف اور متمول خاتون تھی۔ اسکو ریاست کی جانب سے بڑی بڑی جاگیرات

دی گئی تھیں۔

مدارالمہام ارسطوجاہ کے 3 دہوں پر محیط عہد میں فنون لطیفہ کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ اس دور میں موسیقی عروج وکمال پر پہنچ گئی تھی۔ شمالی ہند سے بے شمار فنکار حیدرآباد آکر بس گئے تھے۔ حکومت نے ان کی بھرپور سرپرستی کی اور تنخواہیں جاری کیں۔ حیدرآباد کی چارسوسالہ تاریخ فن موسیقی کی ترقی اور توسیع سے عبارت ہے۔ ملک بھر کے بہترین موسیقار یہاں جمع تھے۔ گانے بجانے کے فن میں اس دور میں حیدرآباد پورے ہندوستان سے آگے تھا۔ طوائفین کے کوٹھے، امراء کے دیوان خانے، عوامی محفلیں، خانقاہیں اور درگاہیں طوائفوں، قوالوں، گلوکاروں کے فنی اظہار کے مقامات تھے۔شاہی دربار میں بھی وقتاً فوقتاً ان کے کمال فن کا مظاہرہ ہوتا رہتا تھا۔

آواز اور لحن خدا کی دین ہے۔ یہ نعمتیں اکتسابی نہیں اس لحاظ سے ہر کس و ناکس موسیقار نہیں بنتا۔ حیدرآباد میں ایک سے بڑا ایک گلوکار موجود تھا۔ ان میں ممتاز ترین فنکار عبدالرؤف اور معزالدین تھے۔ یہ موسیقار شہزادہ معظم جاہ کے مصاحب تھے۔ ان دونوں کے بارے میں " مملکت آصفیہ" میں لکھا ہے

"عبدالرؤف اپنے خداداد لحن کے ساتھ فن موسیقی کی باریکیوں سے کما حقہ واقف تھے۔ ان کی ساحرانہ انداز کی نغمہ سرائی سے اہل محفل مسحور ہوجاتے تھے۔ رؤف جہاں موسیقی کے فن میں یگانہ روزگار تھے وہاں وہ غزل گانے میں اپنا جواب آپ تھے۔

معزالدین کے گانے کا کیا کہنا۔ وہ معظم جاہ بہادر کے دربار کے موسیقار تھے۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ انھوں نے گانا کسی سے سیکھا نہیں۔ گانا قاعدے سے کرتا بھی نہیں۔ محفل کے مذاق کو سمجھ کر گاتے ہیں۔ شاستر کے بموجب گاتے ہیں۔ ہارمونیم، ستار اور طبلہ بھی بجاتے ہیں۔ حافظہ بلا کا ہے۔ اساتذہ کا کلام ان کو ازبر ہے۔"

(مملکت آصفیہ صفحہ 434)۔

حیدرآباد میں فن موسیقی کا ایک سے بڑا ایک ماہر جو اس فن کے ہر شعبہ میں کمال رکھتا تھا طبلہ بجانے والوں میں کرنل فیض جنگ کا نام بے حد مشہور ہوا۔ ان کے گھر ماہرین اور شوقین حضرات کا مجمع سا لگا رہتا۔ ستار بجانے والوں میں پیشہ ور فنکاروں کے علاوہ ایک قابل احترام نام عبدالقیوم باقی کا ملتا ہے جو شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر تھے۔

حیدرآباد میں رائج مختلف ساز اور باجے یہ تھے: پکھاوج (ڈھول مردنگ) تاشہ مرفہ، طبلہ، دمدمہ، دف، دھپڑا، پونگی (تونری)، نفیری، شہنائی، نوبت، بانسری، (مرلی، نے) جھانج، عود (بربط)، سارنگی، نقارہ، تن تنی (انندبہری)، دوتارا، چوتارا، بین، تنبورہ، موربین، ستار، مدھم ستار، طاؤس،

سرود، سرتی، دلربا، نمکی، ہارمنیم، جل ترنگ وغیرہ، وغیرہ۔

مصوری

قدیم ترین فنون میں مصوری کا شمار ہوتا ہے۔ یہ فن جذبات و احساسات کے اظہار کا موثر وسیلہ مانا جاتا ہے۔ ماضی میں لوگ اپنا مافی الضمیر ادا کرنے پتھروں پر مختلف لکیریں اور اشکال بناتے تھے۔ جب اس طریقہ نے ترقی کی تو یہ فن مصوری کی صورت میں پہچانا گیا۔ نقاشی بھی فن مصوری ہی کا ایک شعبہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پہلا اسکول آف آرٹ، پہلا مصور خانہ، مصوری کا پہلا ادارہ دکن میں بمقام اورنگ آباد قائم ہوا۔ اجنتا اور ایلورا کے غاروں میں مصوری کے قدیم اور اعلی ترین نمونے اس کا بین ثبوت ہیں۔ آج بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصور نے ابھی ابھی ان فن پاروں کو مکمل کیا ہے۔ ہزاروں سال گذر جانے کے باوجود ان کی تازگی، جاذبیت اور دلکشی حیرت انگیز ہے۔

حیدرآباد میں مصوری کے فن کے آغاز وارتقاء کے بارے میں یہ اقتباس ایک اہم ذریعہ ہے جس کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ مصوروں کی سرپرستی میں حیدرآباد کا کیا حصہ رہا۔

" پایہ تخت دہلی کے شاہی نگار خانے معطل کر دیئے گئے اور وہاں کے فن کار ملک کے مختلف حصوں میں بکھر گئے تو چند مصوروں نے جو حیدرآباد آکر مقیم ہوئے تھے، مغل مصوری کے ایک نئے اسلوب کی بنا ڈالی جسے دکنی قلم (دکنی اسکول) کہا جاتا ہے۔"

(اقتباس ہندوستانی مصوری کا ارتقاء صفحہ 56 از۔ اے اے موگل و غلام عباس)

آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خاں نے اس فن کو ترقی دینے میں خاص دلچسپی لی تھی اسی علم دوست تاجدار کے عہد میں ایک ادارہ قائم ہوا تھا جس کا نام " حیدرآباد اسکول آف آرٹ۔ تھا جہاں باضابطہ مصوری کی تعلیم کا اعلی پیمانے پر انتظام تھا۔

حیدرآباد کی مردم خیزی ایک زندہ حقیقت ہے۔ یہاں ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے باکمال پیدا ہوئے۔ حیدرآباد نے باہر سے آنے والے فنکاروں کو بھی سرآنکھوں پر بٹھایا۔ حیدرآباد کے چند نامور مصوروں میں عبدالقیوم، فضل اللہ اور محمد تراب کے نام بھی شامل ہیں۔

مجسمہ سازی

فنون لطیفہ میں مجسمہ سازی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اس فن کے عروج و کمال کا اولین نقش ایلورہ اور اجنتا کے غاروں میں نظر آتا ہے۔ پانچ ہزار سال قدیم ان شاہکاروں کو ساری دنیا حیرت و استعجاب سے تکتی ہے۔ مصوری اور مجسمہ سا[illegible] ہے۔ دکن

میں ان فنون لطیفہ کے نمونوں کی موجودگی اس بات پر دال ہیں کہ دنیا بھر میں یہ سب سے قدیم ترین فنی نمونے ہیں۔ بعض ماہرین، مجسمہ سازی اور مصوری کی ابتداء کا سہرا دکن کے سر باندھتے ہیں۔

مجسمہ سازی ایک تخلیقی عمل اور فن لطیف ہے۔ حیدرآباد میں اس فن کی شروعات بہت پہلے ہوئی۔ تدریجی ارتقاء کے نتیجہ میں اس فن کے مختلف نمونے آج بھی مختلف عجائب گھروں، منادر، عمارتوں وغیرہ میں ملتے ہیں۔

عہد آصفی میں اسکول آف آرٹ میں مصوری کے دوش بدوش مجسمہ سازی کی تربیت کا انتظام تھا۔ حیدرآباد کے مجسمہ سازوں نے اپنی صلاحیتوں کے ذریعہ بڑا نام کمایا۔ انسانی جسم کے اعضاء کے ماڈل بنانے میں وہ جواب نہیں رکھتے تھے۔

خطابت

خطابت ساری دنیا میں ایک فن کی حیثیت سے شناخت رکھتی ہے۔ عربوں میں فن خطابت کی زبردست قدر و منزلت اور مانگ تھی۔ ہندوستان میں اس فن نے ایک خاص تناظر میں ترقی پائی۔ حیدرآباد فن خطابت کے ضمن میں کافی شہرت رکھتا ہے۔ کسی خاص تحریک کی کامیابی کا پورا دارومدار ذہن و فکر کی تربیت پر منحصر ہوتا ہے۔ مذہب، معاشرہ اور سیاست کے موضوعات پر جب کوئی باکمال خطیب آتش نوائی شروع کردے تو انقلاب بپا ہو جاتے ہیں۔ حیدرآباد کو اس بات پر بجا طور پر فخر ہوگا کہ اس کی گود سے ایسے ایسے خطباء پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے زور خطابت سے لوگوں کے اذہان و افکار کے دھارے موڑ دیئے۔ اور مذہبی تبلیغ، سماجی اصلاح اور سیاسی انقلاب لے آئے۔ ایسے شعلہ بیانوں میں چند نام ملتے ہیں جن کے اثرات نصف صدی گذر جانے کے باوصف حیدرآباد والوں کے ذہن سے محو نہ ہو سکے ہیں۔

خوش نویسی

خوش نویسی بلاشبہ فنون لطیفہ میں جگہ پاتی ہے۔ حیدرآباد، اس فن کی ترقی کے سلسلے میں بے حد مشہور ہے۔ خوش نویسی کو فن شریف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ بات عام ہے کہ " خط۔ اور " تحریر۔ کے ذریعہ کسی کے اخلاق و اطوار، چال چلن اور فکری رجحانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حیدرآباد میں خوش نویسی کی قدیم تاریخ ملتی ہے۔ ابتداء ہی سے اس فن کی طرف خاص توجہ دی جاتی رہی ہے۔

ماضی میں چونکہ طباعت و اشاعت کی وہ سہولتیں موجود نہ تھیں جو آج میسر ہیں۔ تصنیف و

تالیف کے شعبہ سے اس فن کا گہرا رشتہ رہا ہے۔ تصانیف اور کتابیں بالعموم خوش نویسوں کی محنتوں کے سبب مشہور ہوا کرتے تھے۔ پرانے مخطوطات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حیدرآباد میں یہ فن اپنی تمام تر نزاکتوں، باریکیوں اور کمال کے ساتھ موجود تھا اور اس کے ارتقاء میں اہل حیدرآباد کا گراں قدر حصہ رہا ہے۔

خطاطی

خطاطی اور خوش نویسی میں بین فرق ہے۔ خطاطی ایک علحدہ اور مستقل فن ہے جس کے ارتقاء میں حیدرآباد کا اہم حصہ رہا۔ فنون لطیفہ کی ترقی و ترویج کے ضمن میں آصف جاہی خاندان کے رویہ نے ملک ہند کے بہترین خطاطوں کو یہاں کھینچ لایا۔ یہ خطاط نہ صرف اہم حکومتی امور کی انجام دہی میں اپنے فن کا اظہار کرتے بلکہ علماء اور عوام سے ایک خاص ربط و تعلق رکھتے تھے۔ سرکاری طور پر ان کی خدمات مختلف اہم مراحل میں حاصل کی جاتی تھی جیسے کرنسی نوٹ، کاغذ ممہور (اسٹامپ) ٹکٹ، ڈاک کی ضروریات پر مشتمل کارڈس، لفافے وغیرہ پر خوش ڈیزائن اور نقشے، کتابوں کی لکھائی اور طغروں کی تیاری، حجر نویسی وغیرہ خطاطوں ہی کے فنی کمال کے نمونے تھے۔

حیدرآباد کے ماہر خطاطوں میں سید محمد قدرت اللہ حسینی، امام الدین عتیق، نواب مظفر الدین، محمود نواز خاں، معجز رقم، حشمت علی قادر رقم وغیرہ شامل ہیں۔ حیدرآباد میں خطاطوں کے چار سو سالہ نمونے قدیم عمارتوں، مساجد، درگاہوں خانقاہوں، دیوڑھیوں، چاہ، پل، شاہراہوں وغیرہ پر آج بھی نصب کتبات پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

تعلیق

خطاطی کے کئی شعبے ہیں اور کئی قسمیں جن میں نستعلیق، ثلث، نسخ اور ایمان اور شکستہ وغیرہ شامل ہیں۔ حیدرآباد کے مشہور خطاط امام الدین عتیق نے اپنے فن کمال کے سبب شاہی اعزاز حاصل کئے۔ حیدرآباد کی سرکاری مہریں اور سکہ کا مونوگرام انہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

مظہر الدین مظہر کامل جنہیں "تاج الخطاط" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، حیدرآباد ہی کے تھے اور اپنے فن کے امام مانے جاتے ہیں۔ ان کی حیرت انگیز خطاطی سے اس فن نے نیا وقار حاصل کیا۔

کتابت

خوش نویسی، خطاطی کی طرح کتابت بھی ایک مستقل اور موثر فن لطیف ہے دراصل ان تینوں کا ایک ہی شعبہ سے تعلق ہے۔ پھر بھی فنی شناخت کی خاطر علحدہ ناموں سے یاد کئے جاتے

ہیں۔ کتابت ایک قدیم فن ہے۔ کاتب ہی حقیقت میں ارباب قلم کی کاوشوں کو صفحہ قرطاس پر اپنے خوبصورت خط کے ذریعہ محفوظ کرتا ہے۔

حیدرآباد میں کاتبوں کی ہمیشہ مانگ رہی ہے۔ اچھے کاتب کی رسائی شاہی دربار تک ہوتی تھی۔ پادشاہ بھی کاتب کی قدر افزائی پر مجبور تھے کیونکہ ان کے فن کی شمولیت کے بغیر خود بادشاہ کا فکری و شعری سرمایہ محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ حیدرآباد میں کتبات اور خوش نویسی سکھانے کے کئی ادارے قائم تھے۔ اکثر ماہرین بھی اپنی خاص نگرانی میں شوق رکھنے والوں کو تربیت دیتے تھے۔

آج کل جس طرح دیگر علوم وفنون کی ترقی ہو رہی ہے اسی طرح کتابت کے فن نے بھی اپنا اہم مقام بنالیا ہے۔ تاہم کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی Computerised Caligraphy نے اس کے مستقبل کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔

جلد سازی

یہ دنیا کا سب سے قدیم اور سب سے اہم فن مانا جاتا ہے۔ تحریر کی حفاظت کے لئے اس فن کا وجود ناگزیر ہے۔ اسے فن تجلید بھی کہا جاتا ہے۔ اس فن سے اکثر بزرگان دین وابستہ رہے ہیں۔ حیدرآباد والوں نے بھی اس فن میں خوب نام کمایا اور اس میں نکھار پیدا کیا۔ جلد سازی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ خالص اسلامی فن ہے جس کا علم اور کتاب کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔ حیدرآباد میں جلد سازی کے سینکڑوں کارخانے قائم تھے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اہل حیدرآباد کا علوم اور کتب سے کتنا مضبوط رشتہ تھا۔

شوق و ذوق

اہل حیدرآباد کے شوق و ذوق اور عادات واطوار میں بڑا تنوع ملتا ہے۔ کسی بھی دور میں ان کی سماجی اور معاشرتی سرگرمیاں ماند نہیں پڑیں۔ معاشی آسودگی، مادی خوش حالی، فرصت حیات، ذہنی یکسوئی اور احساس تحفظ نے ان کی فکری صلاحیتوں اور فنی شعور کو خوب پروان چڑھایا۔ گذشتہ چارسو سال سے مختلف فنون کے ارتقاء میں اہل حیدرآباد کے حسن ذوق اور فکری میلان کا بڑا حصہ رہا ہے۔

فنون لطیفہ کی سرپرستی دربار اور امراء کی جانب سے ہوتی تھی۔ عوام نے بھی اس کے فروغ کے لئے بھرپور حصہ لیا۔

نقالی، تمثیل، ڈرامہ

حیدرآباد والوں کے ذوق وشوق اور دلچسپی کے کئی پہلو ہیں۔ ابتداء ہی سے یہ بڑے خوش

طبع، خوش مذاق اور خوش فکر واقع ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ فن، طریقہ اظہار اور فنکار کو بہت چاہتے رہے ہیں۔ حیدرآبادیوں کو اسٹیج سے ہمیشہ دلچسپی رہی اور جب کبھی کوئی ایسا موقع آتا تو اس سے محظوظ ہونے ٹوٹ پڑتے۔ کیا امیر کیا غریب کیا ہندو کیا مسلمان، سبھوں کو نقالی اور تمثیل کا جنون کی حد تک شوق رہا۔

نقالی ایک فطری کمال ہے۔ حیدرآباد میں جب بھی نقال، بھانڈ اور بہروپئے اپنا کمال پیش کرتے اور فنی مظاہرہ کیا کرتے تو شائقین کے ٹھٹ لگ جاتے۔ یہ لوگ بالعموم سرراہ یا کسی میدان یا کھلی جگہ پردے باندھ کر سماج کے مختلف لوگوں کی نقالی کرتے یا کسی خاص قسم کے قصے کہانی کو مخصوص ڈھنگ سے پیش کر کے لوگوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتے۔

محرم میں سوانگ بھرنا بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ اپنے بدن پر رنگ اور نقوش ڈالکر شیر، بندر، لنگور، بیل، بکرا بننا عام شغل تھا۔

"رام لیلا" کا سلسلہ بھی اسی نقالی اور تمثیل سے مربوط مانا جاسکتا ہے۔ ہر سال چند قبائیلی یا پیشہ ور افراد کھلے میدانوں میں پنڈال بنا کر رام چندر جی، سیتا جی اور لکشمن جی کی داستان پیش کرتے، اس کو ہندو مسلمان سبھی نہایت شوق سے دیکھا کرتے تھے۔

حیدرآباد میں ڈرامہ کی تاریخ اگرچہ پرانی نہیں ہے اور نہ اس ضمن میں حیدرآبادیوں کا کوئی گہرا نقش ملتا ہے تاہم ڈرامہ سے دلچسپی اور اس کی حوصلہ افزائی میں حیدرآباد والے کسی سے پیچھے نہیں۔ ڈرامہ دراصل نقالی کی ترقی یافتہ شکل اور فنی ارتقاء کا نمونہ ہے۔ اس کو فنون لطیفہ کی قدیم ترین شکلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں پرانی جنتیں باقی نہیں رہیں۔ آج اس میں دیگر فنون کی آمیزش سے جو امتزاج پیدا ہوا ہے اس کی بھی حیدرآباد میں پذیرائی ہوئی ہے۔

مشاعرہ

مشاعرہ کا تصور عرب شعراء کا دیا ہوا ہے۔ یہ اردو شعراء میں تدریجی طور پر مقبول ہوا۔ مشاعرہ کا جو مکمل روایتی انداز ہے وہ گویا اردو تہذیب کی زندہ تابندہ علامت ہے۔ اردو زبان وادب کی طرح مشاعرہ بھی دکن سے قدیمی تعلق رکھتا ہے۔ اسی بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حیدرآباد اور مشاعرے ایک دوسرے سے بہت پرانے ناطے رکھتے ہیں۔ اردو تہذیب اور لسانی روایات کی بہترین ترجمانی کے اس وسیلہ کو حیدرآباد والوں نے ہمیشہ پسند کیا۔

حیدرآباد میں مشاعروں سے دلچسپی ایک زندہ حقیقت ہے۔ اہل حیدرآباد کے معمولات میں یہ بات شامل ہے کہ جہاں کہیں شعر و ادب کی بات چلے وہاں پوری دلچسپی سے حصہ لیں۔ چنانچہ صدیوں سے حیدرآباد میں شعر و سخن کی محفلیں سجتی آرہی ہیں اور لوگ فکر و خیال کے موتی لوٹ رہے

ہیں۔ مشاعروں میں شرکت کا حیدرآباد والوں کو بہت خاص ذوق ہے ۔ شعراء کی حوصلہ افزائی، اچھے کلام پر بے ساختہ داد دینا، مشاعرے کے اختتام تک پورے انہماک سے ہر شاعر کو سننا ان کے اعلی ذوق کا ثبوت ہے۔

حالیہ عرصہ میں جب مشاعروں کو اچھے مقاصد کے لئے منعقد کرنے کا رجحان پیدا ہوا تو تمام حیدرآبادیوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ گذشتہ ربع صدی سے ایسے بامقصد مشاعروں میں لوگ ٹکٹ خرید کر شرکت کر رہے ہیں۔ یہ بات ان کے ذوق شعری اور اعلی وارفع خیال اور نیک مقاصد سے دلچسپی پر دال ہے۔

حیدرآباد میں سال بھر میں چھوٹے بڑے کئی مشاعرے ہوتے ہیں۔ ہر مشاعرہ میں سامعین کی اچھی خاصی تعداد موجود رہتی ہے۔ بڑے مشاعروں میں ہجوم کا یہ عالم رہتا ہے کہ پولیس بھی انتظام سے معذور نظر آتی ہے۔

رقص و سرود

رقص و سرود مہذب معاشرہ کے معمولات اور تہذیبی سرگرمیوں کا حصہ ہوتے ہیں۔ حیدرآباد والے ناچ گانے کے بیحد رسیا ہیں۔ حیدرآبادی سماج کے تمام طبقات میں یکساں طور پر یہ شوق جنون کی حد تک پایا جاتا ہے۔ امراء و اعلی طبقہ کا تو پوچھنا ہی کیا ان کی زندگی کی اہم مشغولیت یہی تھی۔ ہر دیوڑھی کا دیوان خانہ، پائیں باغ موسیقی کی دلاویزیوں اور رقص و مجرے کی رنگینی سے مزین نظر آیا کرتا تھا۔ ہر ایک کو ناچ گانے سے لطف اندوز ہونے کا شوق اور وہ بھی انتہائی درجہ کو پہنچا ہوا شوق نہ وقت کی قدر ہے نہ روپیہ کا خیال نہ اپنے مقام کا احساس نہ ذمہ داریوں کی پرواہ بس جہاں ناچ گانا ہو وہاں کھینچے چلے گئے۔ امیروں و رئیسوں کو ہی نہیں عام آدمیوں کو بھی یہ شوق اسی طرح تھا۔

حیدرآباد کی کوئی شادی بیاہ، بسم اللہ، گلپوشی، سالگرہ، عید، تہوار، بقرعید ایسی نہیں گذرتی جس میں میزبانوں کی طرف سے یا ذی حیثیت لوگوں کی جانب سے اس طرح کی محفلوں کا اہتمام نہ ہو بلکہ تقاریب کی بنیادی مصروفیت یہی ناچ گانا ہوتا جس کو دیکھنے اور سننے کے لئے مہمانوں کی کثیر تعداد رک جاتی۔ صبح کی تقاریب میں شام تک اور رات کی تقاریب میں صبح تک یہ راگ و رنگ کی محفل جمی رہتی۔ لوگ ناچنے گانے والی طوائفین پر روپئے لٹا دیتے تھے۔

حیدرآباد میں مروج چند مشہور کھیل

چوگان پولو

یہ دنیا کے اہم کھیلوں میں سے ایک مانا جاتا ہے ۔ اسے جری اور بہادر لوگوں کا کھیل سمجھا جاتا ہے ۔ اسے گھوڑے پر سوار ہو کر لکڑی اور گیند سے کھیلتے ہیں۔ حیدرآباد میں پہلی مرتبہ نواب ماہرالدولہ کی نگرانی میں 1870 ء میں چوگان کھیلا گیا تھا۔ گویا آج سے ایک سو چوبیس (124) سال پیشتر ہی پولو حیدرآباد کا مشہور اور پسندیدہ کھیل بن چکا تھا۔

پولو کی پہلی ٹیم 1886 ء میں تشکیل پائی جس کا نام "گولکنڈہ پولو ٹیم" تھا۔ کہا جاتا ہے اس ٹیم میں ایک انگریز بھی شامل تھا۔ اس ٹیم نے کم و بیش 24 سال تک اپنے عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا تھا۔

وقارالامراء بہادر نے بھی ایک ٹیم بنائی تھی۔ اس کے تمام اخراجات وہ خود برداشت کرتے تھے ۔ اس ٹیم نے کئی مقابلے جیتے ۔ اسی طرح نواب فخرالملک کو بھی پولو سے بے حد دلچسپی تھی ۔ انھوں نے اپنی دیوڑھی کے احاطہ میں دو پولو گراؤنڈ بنائے تھے (بستان آصفیہ)

حیدرآباد کے مشہور و معروف اسپورٹسمین کیپٹن شاہ مرزا بیگ نے پولو کے کھیل میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی تھی ۔ انھوں نے کئی اعزازات حاصل کئے ۔ دنیا کے 3 بہترین کھلاڑیوں میں شامل تھے جنھوں نے " دس ہینڈی کیپ" حاصل کئے تھے ۔ ان کے بھائی بھی ایک عمدہ پولو کھلاڑی تھے اور ماہرالدولہ ٹیم کے اہم رکن تھے ۔ شاہ مرزا بیگ نے کنگ جارج پنجم کارونیشن کے موقع پر برطانیہ کی طرف سے امریکہ اور برمنگھم کے خلاف کھیل کر اپنی ٹیم کو فتح دلائی تھی۔

پولو کا کھیل حیدرآباد کے کھلاڑیوں کی دلچسپی، مہارت اور جد و جہد کے سبب یہاں بے حد مقبول ہوا۔ 1910 ء سے 1923 ء تک یہ کھیل بام عروج پر تھا بعد میں بھی جاری رہا مگر پہلی سی بات نہ رہی۔

برگیڈیر مسعود علی خاں نے پولو کے کھیل میں عالمی شہرت حاصل کی تھی، انھیں برطانوی کھلاڑی محبت سے " سبکی بیگ" سے پکارتے تھے ۔ مسعود علی خاں، شاہ مرزا بیگ کے ہونہار شاگرد تھے ۔ انھوں نے پوری دنیا میں پولو کا مظاہرہ کیا تھا ۔ بعد میں پاکستان چلے گئے ۔ بہر حال اہل حیدرآباد نے پولو میں غیر معمولی کمال اور شہرت حاصل کی۔ چوگان کو دنیا بھر میں اعلی پیمانے کا اور دلیرانہ کھیل مانا جاتا ہے ۔ اور حیدرآباد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کھیل میں اس نے ایک سنہری تاریخ مرتب کی ہے۔

فٹ بال

فٹ بال دنیا کے مقبول ترین کھیلوں میں سرفہرست ہے ۔ اس میں دو مقابل ٹیمیں جو 11 ، 11 کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ چمڑے یا پلاسٹک کے گیند کو پیروں سے ڈھکیلتے ، کک لگاتے ، شاٹ مارتے ہوئے مخالف ٹیم کے گول کے اندر پہنچانے کے لئے پوری طاقت ، پھرتی اور ہوشیاری سے کوشش کرتے ہیں۔

فٹ بال کا وقت ایک گھنٹہ ہوتا ہے جو 30 ، 30 منٹ کے دو حصوں میں بانٹا جاتا ہے ۔ درمیان میں 15 منٹ کا وقفہ دیا جاتا ہے ۔ فٹ بال کھلے میدان میں کھیلا جاتا ہے ۔ میدان کم از کم 90 میٹر لانبا اور 48 میٹر چوڑا (300 فٹ طول اور 160 فٹ عرض) ہوتا ہے ۔ درمیان میں ایک لکیر کھینچ دی جاتی ہے ۔ لکیر کی دونوں جانب مخالف ٹیمیں کھیل شروع کرتی ہیں۔ دونوں طرف انتہائی سرے پر لائن سے متصل درمیانی حصہ میں ایک دوسرے کے محاذی 5 گز مربع حصہ میں گول بنایا جاتا ہے جس کے تین طرف جالی لگادی جاتی ہے ۔ گول کی بلندی بالعموم 6 میٹر ہوا کرتی ہے ۔ گول کے سامنے 3 میٹر یا 10 فٹ آگے سے ایک لائن کھینچ دی جاتی ہے جس کے اندر سے گول کے لئے شاٹ یا دھکا لگانا ہوتا ہے ۔ اگر گیند گول کے اندر پہنچ جائے تو گول ۔ شمار ہوتا ہے ۔

فٹ بال کے لئے بین الاقوامی سطح پر چند قواعد مقرر ہیں جن کی پابندی دنیا بھر میں کی جاتی ہے ۔ بعض جگہوں پر دیگر ضوابط کی بھی پابندی کی جاتی ہے جو مقامی طور پر عائد کئے جاتے ہیں۔

حیدرآباد نے پولو کی طرح فٹ بال میں بھی بے حد نام کمایا ۔ اس کھیل کو 1911 ء کے بعد سے بحد ترقی ملی ۔ حیدرآباد میں فٹ بال کی کئی ٹیمیں تشکیل پائی تھیں ۔ اس سلسلہ کا پہلا کلب " یونی سن کلب " تھا ۔ فٹ بال ٹیموں میں دکن کلب ، حیدرآباد ٹیم ، نظام کارونیشن اور میری گوراونڈ بحد مشہور تھیں ۔ موخرالذکر نے کئی مقابلے جیتے تھے ۔ اس ٹیم کے سرپرست دلی دادخاں مندوزئی تھے اور گول کیپر ، قادرخاں تھے ۔

سٹی افغان پولیس ٹیم کلکتہ کی محمڈن اسپورٹس کی ہم پلہ ٹیم تھی ۔ حیدرآباد میں فٹ بال کی ترویج و ترقی میں امراء کا اہم حصہ رہا ہے ۔ نواب تازبن کو اس کے فروغ سے بحد دلچسپی تھی ۔ فزیکل ٹریننگ کالج حیدرآباد میں فٹ بال کی خصوصی کوچنگ کی جاتی تھی ۔ مشہور کھلاڑی عبدالرحیم ۔ یہیں کے تربیت یافتہ تھے ۔ حیدرآباد کے معروف کھلاڑیوں میں سے چند نام یہ ہیں ۔

جلیل ، حبیب احمد ، محبوب ، شیرخاں ، محمد علی ذم ، معین اور لطیف وغیرہ یہ سارے کھلاڑی اپنی پھرتی ، تکنک ، فنی آگہی اور بے پناہ صلاحیتوں کی وجہ سے حیدرآباد فٹ بال ٹیم کو ہمیشہ کامیابی سے ہمکنار کیا کرتے تھے ۔

فٹ بال اب بھی کھیلا جاتا ہے۔ حیدرآباد میں بڑے بڑے اسٹیڈیم اور فٹ بال گراؤنڈ بنے ہوئے ہیں۔ حکومت کی سرپرستی اور نگرانی بھی قائم ہے۔ مختلف محکموں جیسے ریلوے، ہوابازی، پولیس، اسٹیٹ بنک اور صنعتی اداروں کی بھی فٹ بال ٹیمیں موجود ہیں لیکن جانے کیوں۔ ماضی کی طرح کھیل ہے نہ وہ جذبہ کھیل۔ کھلاڑیاں تو اب بھی موجود ہیں مگر ان میں وہ قوت برداشت ہے نہ وہ طاقت ہے نہ وہ صلاحیت و پھرتی ہے اور کا سبب شاید ٹیم کے انتخاب میں صلاحیتوں سے زیادہ سفارشوں کا زور ہے۔

باسکٹ بال

باسکٹ بال بھی دنیا کے مقبول کھیلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز امریکہ میں 1891ء میں ہوا۔ اس کھیل میں دو حریف ٹیمیں 5، 5 کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ باسکٹ بال کھیل میدان کے بجائے کورٹ پر کھیلا جاتا ہے جس کا احاطہ بالعموم 74 تا 94 فٹ طویل اور 42 تا 50 فٹ عریض ہوتا ہے۔ دو باسکٹ احاطہ کے دونوں طرف درمیانی حصہ محاذی لگائے جاتے ہیں۔ باسکٹ کے ستون 10 فٹ اونچے ہوتے ہیں اس سے متصل پیچھے سیاہ تختے لگے ہوتے ہیں۔ گیند کا قطر 76 سینٹی میٹر ہوتا ہے اور جس کے اطراف چمڑا منڈھا ہوتا ہے۔ حریف ٹیمیں مختلف طریقوں سے جو خلاف قاعدہ نہیں ہوسکتے گیند کو باسکٹ میں ڈالتے ہیں۔

حیدرآباد میں باسکٹ بال کا رواج جاریہ صدی کے ابتدائی دہوں میں ہو چکا تھا۔ باسکٹ بال کی مقبولیت کا لحاظ کرتے ہوئے حیدرآبادی کھلاڑیوں نے اس کھیل میں بیحد دلچسپی اور محنت سے نام کمایا۔ حیدرآباد باسکٹ بال ٹیم کے علاوہ ریلوے، بنک، پولیس اور دیگر ٹیمیں بھی اس کھیل کے فروغ میں سرگرم حصہ لیتی رہی ہیں۔ حیدرآباد کے مشہور باسکٹ بال کھلاڑیوں میں علی باشاہ قادری شامل ہیں۔

ہینڈ بال

ہینڈ بال کھیلنے کے لئے ریاکٹ کے بجائے ہاتھوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ کھیل بالعموم دو کھلاڑی ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے ہو کر کھیلا کرتے ہیں۔ اس کھیل میں سخت چوبی گیند استعمال کیا جاتا ہے۔ ہینڈ بال بھی کورٹ پر کھیلا جاتا ہے۔

اہل حیدرآباد کو ہینڈ بال سے ایک حد تک دلچسپی رہی ہے۔ ہینڈ بال کھیلنے والے حیدرآبادی کھلاڑیوں نے مختلف مقابلوں میں حصہ لیکر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا ہے۔

ہاکی

ہاکی ایشیائی کھیلوں میں سب سے زیادہ مقبول کھیل تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ کھیل بھی کم و بیش فٹ بال کی طرح ہوتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اس کھیل میں اسٹکس استعمال ہوتی ہیں اور گیند کی سائز چھوٹی ہوتی ہے۔

حیدرآباد میں فٹ بال کی طرح ہاکی بھی بہت پسندیدہ کھیل رہا ہے۔ عرصہ دراز تک اس کھیل میں حیدرآباد کی برتری مسلمہ تھی۔ جامعہ عثمانیہ اور نظام کالج کی ٹیموں کی سارے ہندوستان میں دھوم تھی اور آج بھی لگ بھگ تمام کالجس میں ہاکی ٹیمیں موجود ہیں۔ ہائی اسکولس میں بھی ہاکی ٹیمیں تشکیل دیجاتی تھیں۔ حیدرآباد ہاکی ٹیم نے خوب نام کمایا تھا۔

مدارس اور کالجس کے علاوہ مختلف محکموں اور سرکاری اداروں کی علحدہ ٹیمیں ہاکی کھیلتی ہیں ہاکی کے بین الاقوامی مقابلوں میں بعض حیدرآبادی کھلاڑی بھی شامل رہے ہیں۔

کرکٹ

کرکٹ کا شمار میدانی کھیلوں میں ہوتا ہے۔ یوروپ اور ایشیاء کے اکثر ممالک میں یہ کھیل زائد از ایک صدی سے کھیلا جارہا ہے۔ یہ دو حریف ٹیموں کے درمیان کھیلا جاتا ہے۔ ہر ایک ٹیم 11 کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ کرکٹ کھلے میدان میں جس پر گھاس اگی ہوتی ہے کھیلا جاتا ہے۔ کرکٹ کا میدان مربع یا مستطیل نہیں ہوتا بلکہ گول دائرہ نما بنایا جاتا ہے۔ دائرہ پر لائن کھینچی جاتی ہے۔ درمیان میں پچ بناتے ہیں۔ یہ مسطح اور خشک ہوتی ہے۔ پچ کے دونوں کناروں پر تین تین چھوٹی لکڑیاں جنھیں وکٹ کہا جاتا ہے کھڑی کی جاتی ہیں۔ کھیل سے پہلے قرعہ اندازی کے ذریعہ بیاٹنگ اور بولنگ و فیلڈنگ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ بولنگ کرنے والی ٹیم کے تمام ارکان میدان میں پھیل جاتے ہیں اور حریف ٹیم کے دو کھلاڑی بیاٹنگ کے لئے وکٹوں کے پاس کھڑے ہوتے ہیں۔

حیدرآباد نے کھیلوں کے تمام شعبوں میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ حیدرآباد چونکہ شاہی طرز حکومت کا حامل تھا۔ کرکٹ کو چونکہ رائل گیم کہا جاتا ہے اس وجہ سے حیدرآباد کے حکمران اور امراء و جاگیرداروں نے اس کھیل کی ترقی اور ترویج میں بے پناہ دلچسپی دکھائی۔ یہ بڑے لوگوں کا کھیل مانا جاتا تھا۔ اس کے باوجود حیدرآباد کے عام لوگوں کو بھی اس کھیل سے بے حد دلچسپی رہی۔

ہائی اسکولوں اور کالجس میں طلباء کی ٹیمیں بنائی جاتی تھیں اور آج بھی اس کا رواج ہے۔ مملکت حیدرآباد کی طرف سے کرکٹ ٹورنمنٹ منعقد کئے جاتے تھے۔ حکومت باصلاحیت کھلاڑیوں کی سرپرستی کرتی تھی۔ حیدرآباد میں کرکٹ نے بہت جلد مقبولیت پائی۔

نواب معین الدولہ نے اپنے نام سے معین الدولہ ٹورنمنٹ شروع کیا جس میں ملک اور بیرون ملک کی نامور ٹیمیں حصہ لیا کرتی تھیں۔ یہ ٹورنمنٹ سکندرآباد کے پریڈ گراونڈ پر ہوا کرتے

تھے ۔ کھیل کے زمانے میں وہاں میلہ لگتا تھا۔ تاجرین اپنے اپنے اسٹال اور شامیانے لگاتے تھے ۔ کھیل دیکھنے کے لئے ٹکٹ کا لزوم تھا۔

آزادی کے بعد بھی حیدرآباد میں کرکٹ کا شوق برابر پروان چڑھتا رہا۔ پچھلے 2 ،3 دہوں سے یہ شوق جنون کی حد کو پار کر گیا ہے ۔ حیدرآباد میں کئی انٹر نیشنل ٹسٹ اور مقابلے ہو چکے ہیں۔ حیدرآباد میں کرکٹ کے لئے بہترین اسٹیڈیم موجود ہیں۔ فتح میدان گراؤنڈ پر جسے لال بہادر اسٹیڈیم سے موسوم کیا گیا ہے کرکٹ کے میاچس ہوا کرتے ہیں۔

حیدرآباد نے کرکٹ کے میدان میں خوب نام کمایا ہے ۔ یہاں کے باصلاحیت کھلاڑیوں نے نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان کی قومی ٹیم میں بھی اپنا لوہا منوایا ہے ۔ حیدرآباد کا نوجوان طبقہ کرکٹ سے بے حد دلچسپی رکھتا ہے ۔ حیدرآباد کے نامور کھلاڑیوں میں فقیر شاہ، سید محمد ہادی ، محمد حسین ، غلام احمد ، اصغر علی ، آصف اقبال ، عباس علی ، جے سمہا ، عابد علی ، شیولال یادو ، محمد اظہر الدین اور ارشد ایوب شامل ہیں۔ محمد اظہر الدین نے کئی عالمی ریکارڈ قائم کئے اور ان دنوں ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے کپتان ہیں۔

ٹینس

ٹینس ریاکٹ کے ساتھ دو یا چار افراد، ایک ایک یا دو، دو کی ٹیم بنا کر کھیلتے ہیں۔ اس گیم میں بھی مقابلہ ہوتا ہے ۔ یہ میدان یا کورٹ دونوں جگہوں پر کھیلا جاتا ہے ۔ کورٹ یا میدان میں مندہ، سمنٹ، سینتھک اور لکڑی کے تختے جمائے جاتے ہیں۔ ٹینس کا آغاز برطانیہ میں ہوا۔ انیسویں صدی کے آخر میں یہ کھیل حیدرآباد میں شروع ہوا۔ ٹینس کا ریاکٹ لکڑی یا دھات کا ہوتا ہے جو بالعموم 27 انچ لانبا اور اس کے سرے پر ایک بیضوی شکل کی جال بنی ہوتی ہے ۔ یہ جال ریشمی یا نائیلون کی ڈور سے بنی جاتی ہے ۔ ٹینس بال کا قطر ڈھائی انچ ہوتا ہے ۔ ٹینس کے قدیم ترین ٹائٹل میاچ میں ڈیوس کپ، ویمبلڈن، فرنچ اوپن، امریکن اوپن اور آسٹریلین اوپن شامل ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتداء میں حیدرآباد میں ٹینس کو مقبولیت حاصل ہوئی ۔ کئی امراء نے اپنے اپنے گھروں میں ٹینس کورٹ بنائے ۔ وائی ایم سی اے ، نظام کلب اور باغ عامہ میں ٹینس کے مستقل کورٹ قائم تھے جہاں پر شائقین کا کھیل کے وقت ہجوم رہتا تھا۔ حیدرآباد میں ٹینس کے کئی بین الاقوامی مقابلے ہوتے رہے ہیں۔

ٹینس کے مقابلوں میں حیدرآبادیوں نے کئی مرتبہ کامیابی حاصل کر کے اعزاز پائے ۔ ایس ایم ہادی اور محمد حسین ٹینس کے ماہر کھلاڑی تھے جنھوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی اور حیدرآباد کا نام اونچا کیا۔

CENTRE ... URDU ... [stamp]

ٹیبل ٹینس

ٹیبل ٹینس کو پنگ پانگ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ میدانی کھیل نہیں بلکہ 9X5 فٹ سائز کے ٹیبل پر جس کے بیچ میں جال بندھی ہوتی ہے جو چھ انچ اونچی ہوتی ہے، ایک چھوٹے سے ہلکے پھلکے گیند اور چھوٹے چھوٹے دستی ریاکٹ یا بیاٹ سے کھیلا جاتا ہے۔ حریف ٹیمیں ایک، ایک یا دو، دو افراد پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جیت ہار کا فیصلہ پائنٹس کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

حیدرآباد میں ٹیبل ٹینس کا رواج یوروپین اثر نفوذ کے سبب ہوا۔ ٹیبل ٹینس نے یہاں بہت جلد مقبولیت حاصل کرلی۔ تقریباً ہر امیر اور اعلیٰ عہدہ دار کے پاس اس کے گھریلو کورٹ ہوا کرتے تھے۔ عام لوگ بھی اس کھیل کو بہت دلچسپی سے کھیلا کرتے تھے۔

بلیرڈ

بلیرڈ بھی ایک مقبول ترین کھیل ہے جسے حیدرآباد کے امراء اور اعلیٰ عہدہ دار کھیلا کرتے تھے اور آج بھی سماج کا اونچا طبقہ اسے کھیلنا اپنے لئے باعث افتخار سمجھتا ہے۔ ایک مستطیل میز پر خاص قسم کی لانبی اسٹکس اور ہمہ رنگی گیندوں سے یہ کھیل نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔

حیدرآباد کے امراء کے گھروں میں بلیرڈ کورٹ بنے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں نظام کلب، فتح میدان کلب، بوٹ کلب، وائی ایم سی اے، سکندرآباد کلب اور متعدد خانگی کلبوں اور ہوٹلوں میں بلیرڈ کورٹ ملتے ہیں۔ بلیرڈ کو آج بھی اعلیٰ درجہ اور بڑے لوگوں کا کھیل مانا جاتا ہے۔ حیدرآباد میں کھلاڑیوں نے متعدد بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لیکر اس کھیل سے اپنی دلچسپی اور اس میں اپنی مہارت کا سکہ بٹھایا ہے۔

گولف

گولف سرسبز و شاداب میدان میں 100 سے 600 فٹ طویل فاصلہ سے گیند کو ایک مخصوص سوراخ میں ڈالنے والا نہایت دلچسپ اور پرسکون کھیل ہے۔ اس کھیل کا آغاز بھی یوروپ میں ہوا۔ حیدرآباد کے چند امیر کبیر اس کھیل میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے مضافاتی کوٹھیوں میں گولف گراؤنڈ بنے ہوئے تھے۔ اس کھیل میں نظر قیاس، ارادہ اور نشانے پر انحصار ہوتا ہے۔ یہ کھیل عوامی حلقوں میں عدم مقبول رہا۔

تیراکی یا سوئمنگ

تیراکی یا سوئمنگ ایک نہایت دلچسپ مشغلہ اور عمدہ کھیل ہے جسے فن شناوری سے بھی موسوم کیا جاتا ہے ۔ حیدرآباد والوں کو تیراکی سے بے حد دلچسپی ہے خود حیدرآباد میں بے شمار باؤلیاں، تالاب، کنٹے اور حوض موجود ہیں اس وجہ سے یہاں پر تیراکوں کی کوئی کمی نہیں۔ تیراکی کے فن میں ایک سے ایک ماہر حیدرآباد میں موجود تھے ۔ اس فن سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو کمر سے خشک کدو اور "ہلکامدلا" باندھ کر پانی میں ڈھکیل دیا جاتا تھا۔ موسم گرما میں باؤلیوں پر بچوں اور بڑوں کا اژدھام سا رہتا۔

حیدرآباد میں تیراکی کے فن نے بہت ترقی کی۔ یہاں پر بےمثال غوطہ خور موجود تھے جو اونچی جگہوں، درختوں، مونھ، مکانات کی چھتوں سے باؤلیوں میں چھلانگ لگاتے اور بڑی گہرائی تک پانی میں چلے جاتے ۔ بڑی دیر کے بعد سطح آب پر برآمد ہوا کرتے تھے ۔

بلدیہ حیدرآباد کی جانب سے شہر میں ایک سوئمنگ پول بھی قائم تھا جہاں معمولی سی فیس پر تیراکی سکھائی جاتی تھی۔

ماہر تیراک پانی میں مختلف کرتب دکھایا کرتے ۔ بعض پانی کی سطح پر بیٹھ جاتے ، بعض گھنٹوں پانی میں ڈوبے رہتے ۔ بعض دم سادھے کئی گھنٹے سطح آب پر لیٹے رہتے ۔ حیدرآباد کے مشہور تیراکوں میں حضرت سید نظام الدین صاحب چشتی (تیرانے والے صاحب) اور شفیع احمد کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

بچوں کے کھیل

کھیل کود کے معاملہ میں حیدرآباد کے بچے بڑے سبھی یکساں مزاج رکھتے ہیں۔ بڑوں کے کھیل کود جسمانی ورزش، بھاگ دوڑ، خوب سرگرم نوعیت کے ہوا کرتے ہیں تو بچے بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ بچوں کے کھیلوں کا حساب و شمار ممکن نہیں کیونکہ وہ سینکڑوں قسم کی مشغولیات میں بطور کھیل و کود مصروف رہا کرتے ہیں۔ بچوں کے کھیلوں میں قدیم وجدید دونوں انداز جھلکتے ہیں۔

رسی

کمسن بچیوں اور نوعمر لڑکیوں کا پسندیدہ مشغلہ رسی کھیلنا ہوتا ہے ۔ حیدرآباد میں یہ کھیل گھر گھر عام ہے ۔ یہ کھیل کا کھیل اور ورزش کی ورزش۔ بچیاں ایک تین ساڑھے تین گز لانبی موٹی سی سوتی رسی لیکر اس کے دونوں سروں پر گانٹھ ڈالدیتی ہیں اور انہیں دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر سر کے اوپر اور پیروں کے نیچے سے گھمائی جاتی ہیں اور گنتی کرتی جاتی ہیں۔ گویا لڑکیوں میں آپسی طور پر یہ بات زیر بحث ہوتی ہے کہ ایک سانس میں کتنی بار رسی گھمائی گئی رسی کو 70 بار 80 بار یا 100 بار رسی

کھیلنا کہتی ہیں جو ایک ہی سانس میں زیادہ سے زیادہ رسی کھیلے اسکی خوب قدر ہوتی ہے۔

غلیل

حیدرآباد کے چھوٹے بچے کسی درخت کی سہ شاخہ لکڑی پر ربر کاٹ کر باندھتے ہیں۔ ربر اس لکڑی کے دوسروں پر باندھا جاتا ہے۔ ربر چونکہ بڑالیا جاتا ہے لہذا زائد حصہ لٹکتا رہتا ہے۔ لکڑی کے تیسرے سر کو ہاتھ سے پکڑتے ہیں جس وقت غلیل چلانی ہو تو ربر کے بیچ حصہ میں ایک کنکر، ٹھیکری، کوئی چیز رکھ کر ایک ہاتھ سے لکڑی کا تیسرا سرا اور دوسرے ہاتھ میں ربر کا حصہ جس میں پتھر بندھا ہوتا ہے، خوب کھینچ کر جس کو نشانہ بنانا ہوتا ہے، اچھی طرح نشانہ باندھ کر ربر کے حصہ میں چھپا ہوا کنکر یا پتھر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ بندوق کی گولی کی طرح تیزی سے اپنے نشانہ پر جا لگتا ہے۔ اس کھیل سے بڑے بچوں کو روکتے بھی ہیں مگر وہ کب ماننے والے، برابر غلیل بازی میں مشغول رہا کرتے ہیں۔

گولیاں

حیدرآباد کے بچوں میں کانچ کی گولیاں کھیلنے کی عادت بڑی شدت سے ملتی ہے۔ بچے بالعموم کسی دیوار کے سامنے میں ایک چھوٹا گڑھا بنا کر اس کے تین طرف لکیریں کھینچتے ہیں پھر جتنے کھیلنے والے ہیں فی کس ایک یا دو کے حساب سے گولیاں جمع کر کے ایک کے بعد ایک ان تمام گولیوں کو ان لکیروں کے اندر پھینکتے ہیں جو گولی گڑھے میں چلی جائے اسے - گھل گئی - کہا جاتا ہے یعنی کھیلنے والے کا اس پر حق ہو جاتا ہے۔ مابقی بکھری ہوئی گولیوں میں سے نشاندہی پر ایک بڑی گولی جسے نمپورا کہا جاتا ہے، سے نشانہ لگانا پڑتا ہے۔ اگر نشانہ چوک جائے تو باری ختم ہو جاتی ہے، اگر نشانہ لگ جائے تو ساری گولیاں اسکی ہو جاتی ہیں۔

حیدرآباد میں بچے اس کھیل کو کئی طرح سے کھیلتے ہیں۔ کانچ کی گولیوں کے ساتھ ساتھ سمنٹ کی گولیاں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ کھیلوں کے رسیا بچوں کی جیبوں میں ہمیشہ گولیاں بھری رہتی ہیں۔

ڈھکن

جس طرح گولیاں کھیلی جاتی ہیں اسی طرح بعض بچے ڈھکن بھی کھیلتے ہیں۔ ڈھکن دراصل لیمن، سوڈا اور اسی طرح کے مشروبات کے شیشوں کے کاک ہوتے ہیں۔

گلی ڈنڈا

گلی ڈنڈا کو حیدرآباد میں گلی ڈانڈل کہا جاتا ہے۔ یہ کھیل کم و بیش پوری دنیا کے بچے مختلف ڈھنگ سے کھیلا کرتے ہیں۔ حیدرآباد میں اس گلی ڈنڈا کی مقبولیت کا اندازہ اسبات سے لگایا جاسکتا ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا شخص ملے جس نے اپنے بچپن میں یہ کھیل نہ کھیلا ہو۔ آج کل جدید کھیلوں میں دلچسپی کے سبب گلی ڈنڈا کا رواج کم ہورہا ہے تاہم حیدرآباد کے بچے اس کھیل کو بھولے نہیں ہیں۔

2 فٹ یا 2.50 فٹ لانبی اور کسی قدر موٹی لکڑی لیکر اس کے ایک سرے کو چھیل کر نوکدار بنادیا جاتا ہے۔ ایک چھ انچ کی دوسری لکڑی لیکر اس کے دونوں کونے چھیل کر نوکدار بنادیتے ہیں۔ لیجئے گلی ڈنڈا تیار ہوگیا۔ زمین پر ایک چھ انچ 3 انچ گہرا گڑا کھود کر تیار کرتے ہیں اسے "کوئی" کہا جاتا ہے۔ کھیلنے والے بچے قرعہ کے ذریعہ ٹیم کا انتخاب کرتے ہیں پھر قرعہ ہی سے پہلے اور آخر کھیلنے کا فیصلہ کرتے ہیں جس کی باری ہوتی ہے وہ کوئی کے سرے پر گلی رکھتا ہے اور ڈانڈل سے اسے دور اچھالتا ہے اگر کوئی لڑکا گلی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑلے اور زمین پر گرنے نہ دے تو کھیلنے والا آؤٹ (کھیل سے باہر) ہوجاتا ہے۔ اگر گلی زمین پر آرہے تو حریف ٹیم کا کوئی لڑکا اسی مقام سے گلی کو کوئی اور ڈانڈل کی طرف پھینکتا ہے۔ اگر گلی ڈانڈل کو لگ جائے تو کھیلنے والا آؤٹ ہوگا ورنہ اسے اب تین مرتبہ گلی کو ڈانڈل سے اچھال کر خوب زور سے گلی پر مار کر دور تک پہنچانے کا اختیار ہوتا ہے وہ جتنی دور ممکن ہوتا ہے گلی کو ڈانڈل کی مار سے پہنچاتا ہے اور کوئی کے فاصلہ کے لحاظ سے "لال" مانگتا ہے جس طرح کرکٹ میں رن ہوا کرتے ہیں گلی ڈنڈا میں لال شمار ہوتے ہیں۔ تین مرتبہ گلی اچھالنے کے دوران بھی اگر کوئی کیاچ کرلے تو کھیلنے والا آؤٹ قرار پاتا ہے۔

دونوں حریف ٹیمیں اس کھیل کو جیتنے کے لئے ایڑی چوٹی کازور لگاتی ہیں جو ٹیم آخر تک کھیلے اور زیادہ لال بنانے وہی جیت جاتی ہے۔ ہارنے والی ٹیم کو جیت کے سلسلہ میں جتنے لال زیادہ ملے اس حساب سے ہارنے والی ٹیم کو ایک پیر پر لنگڑاتے ہوئے کوئی تک آنا پڑتا ہے۔

آنکھ مچولی

بچوں کے دلچسپ کھیلوں میں آنکھ مچولی بہت عام ہے۔ چھوٹی عمر کے لڑکے لڑکیاں یہ کھیل بالعموم چاندنی راتوں میں گھر کے وسیع و عریض صحن میں کھیلا کرتے ہیں۔ جن گھروں میں پائیں باغ وغیرہ ہو تو کھیل کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔ بعض بچے گھروں کے سامنے گلی میں بھی کھیلا کرتے ہیں۔ دس بارہ بچے ملکر پہلے قرعہ ڈالتے ہیں یعنی چار چار، پانچ پانچ ملکر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہوتے ہیں پھر ایک خاص اشارہ پر اپنے اپنے ہاتھ چھڑا کر ایک ہتھیلی پر دوسری

ہتھیلی سیدھی یا اولٹی رکھدیتے ہیں۔ سیدھی ہتھیلی چت اور الٹی ہتھیلی پٹ کہلاتی ہے جس وقت سب بچے ایک ساتھ ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں کوئی ایک کہتا ہے پٹ تو جتنے بچے پٹ ڈالے تھے وہ گویا کھیل کے لئے منتخب ہوگئے پھر باقی بچے اسی طرح کرتے ہیں اس دفعہ اگر چت کیا جائے تو چت والے منتخب ہوجاتے ہیں اسی طرح اس کو تال ڈالنا کہتے ہیں۔ سب سے آخر میں جو بچہ رہتا ہے وہ چور بنتا ہے۔ کوئی ایک بچہ جو کھیل کھیلتا ہے "چور" کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھکر اس کی آنکھیں بند کر دیتا ہے اور اس طرح بلند آواز سے کہتا ہے۔

آنکھ مچولی کڑوا تیل   بلی پادے وہی چھلیل

اس دوران سب بچے چھپ جاتے ہیں اور کھلانے والا چور کی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا دیتا ہے، اب جو چور بنتا ہے وہ ہر ایک کو تلاش کرتا ہے۔ باقی سب بچے جو چھپے رہتے ہیں کسی طرح کھلانے والے تک پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ اس کو چھوکر چور بننے سے بچ جائیں۔ "چور" اس دوران جس کسی کو چھولیتا ہے وہ چور بنتا ہے، اگر کوئی بھی چھوا نہ جاسکے تو وہی "چور" دوبارہ چور بنا رہتا ہے۔ اس طرح یہ دلچسپ کھیل گھنٹہ دو گھنٹے تک یا بچوں کے تھکنے تک جاری رہتا ہے۔ کھیل کے دوران بڑے بھی دلچسپی سے دیکھتے اور محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ بچوں کی ہوشیاری اور پھرتیلے پن کی تعریف کرتے جاتے ہیں۔

اندھے پاشا

اس کھیل میں جو چور بنتا ہے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے۔ سب بچے اس کے اطراف اچھل کود کرتے رہتے ہیں۔ مگر آواز نہیں نکالتے کیوں کہ آواز کی طرف "چور" دوڑتا اور اندازے پر کسی بھی بچے کو چھوکر اسے چور بنا دیتا ہے۔ اس طرح یہ دلچسپ کھیل دیر تک چلتا رہتا ہے اس سے بچوں کو اچھی خاصی ورزش بھی ہوجاتی ہے۔

مطبوعات سیاست

۱۔ شہر حیدرآباد
۲۔ برجستہ اشعار
۳۔ حیدرآباد نگینہ
۴۔ صورت گران دکن
۵۔ دکن دیس
۶۔ بگھی کے پیچھے چھوکرا
۷۔ نادر اشعار
۸۔ قدیم شہر کا معاشی سروے
۹۔ شاعری کے کرشمے
۱۰۔ حیدرآباد کی داستان۔ مشاہیر کی زبانی
۱۱۔ گنجینہ اشعار
۱۲۔ حیدرآباد کبھی ایسا بھی تھا
۱۳۔ امجد سے شاذ تک
۱۴۔ پیغمبران حق
۱۵۔ حیدرآباد تب اور اب
۱۶۔ شیشہ و تیشہ
۱۷۔ بیرونی مشاہیر ادب اور حیدرآباد
۱۸۔ شہر فسوں حیدرآباد
۱۹۔ حیدرآباد کے محلے
۲۰۔ حیدرآباد شعر کے آئینہ میں
۲۱۔ بھاگ متی
۲۲۔ حیدرآباد کے قصے، کہانیاں اور روایات
۲۳۔ تاریخ حیدرآباد